بیاد: حضرت حافظ عبدالستار صاحب عزیزیؒ

دینی، دعوتی، علمی، ادبی، تحقیقی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ نقوش اسلام

Issue.No10,11,12 | دسمبر/جنوری/فروری ۲۰۱۷ء (Des.Jan.Feb2017) ربیع الاول/ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ | VOL.No.11

مجلس سرپرستان

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ولی مرتاض حضرت مولانا سید مکرم حسین سنسارپوری
عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم رائے پوری
پیر طریقت حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی

مجلس مشاورت

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی
مولانا بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی، مولانا محمد عامر صدیقی ندوی
مولانا محمد احمد صالح جی، الحاج موسیٰ اسماعیل درسوت
مولانا حافظ محمد ایوب، مولانا حسن مرچی، مولانا محمد زکریا پٹیل
مولانا یحییٰ بام، مولانا رشید احمد ندوی، مولانا محمد منذر ندوی

مجلس ادارت

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی ❀ مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری ❀ مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

چیف ایڈیٹر
محمد مسعود عزیزی ندوی

مدیر انتظامی
ڈاکٹر مرغوب عالم عزیزی

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

NUQOOSH-E- ISLAM
MUZAFFARABAD.SAHARANPUR.247129
(U.P)INDIA.Cell.09719831058
E.mail : nuqooshe_islam@yahoo.co.in
masood_azizinadwi@yahoo.co.in
www. nuqoosheislam.com , www. mifiin.org
ماہنامہ ''نقوش اسلام''مظفرآباد، سہارنپور 247129 (یوپی) انڈیا

شرح خریداری

هندوستان کے لیے
فی شمارہ.......................۲۰/روپئے
سالانہ.......................۲۴۰/روپئے
خصوصی...... ......۵۰۰۰/روپئے
ایشیائی، یورپی افریقی وامریکی ممالک کے لیے ۵۰/ڈالر

رسالہ کے جملہ امور سے متعلق اس نمبر پر رابطہ کریں: 09719639955

منیجر توسیع واشاعت: قاری محمد صالحین
Mob: 09813806392

Markazu Ihyail Fikril Islami , A/C No. 30416183580,S.B.I
Monthly Nuqoosh-e-Islam, A/C No. 30557882360,S.B.I

PRINTED, PUBLISHED AND OWNED: MD FURQAN
PRINTEDAT LUXMI PRINTING PRESS SAHARANPUR
EDITOR: MD FURQAN

iles\A017.TI not found. Files\A025.TIF not found. iles\A017.TI not found.

اس شمارے میں

عناوین	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ		۳
دعوت وتبلیغ-ضرورت،اہمیت اورطریقہ کار	محمد مسعود عزیزی ندوی	
یاد رفتگاں		۶
حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ	حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی	
رہنمائے طلبہ		۷
طلبہ تحریک میں تربیتی پہلو	ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی، بھٹکل	
شخصیات		۱۲
چوں رابع مربی ندیدم کسے	مولانا محمد اکرم ندوی، لندن	
انجام کار		۱۷
مجھ پر موت کے بعد کیا بیتی؟	پیشکش: محمد عبداللہ، سعودی عرب	
نقوش حیات		۲۱
حضرت حکیم مفتی احمد حسن خان ٹونکیؒ	مولانا نواب عالم ندوی، اجمیر	
حقائق		۲۸
اردو زبان وادب کے ارتقاء میں دکن کا حصہ	محمد مسعود عزیزی ندوی	
جائزہ		۳۶
دکن کے مشہور شاعروں ومصنفوں کا تذکرہ	حمید اللہ قاسمی کبیر نگری	
ہونہار بروا		۴۱
تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے!	مولانا کفیل احمد ندوی، لکھنؤ	
غوروفکر		۴۳
والدین جنت کی شاہ کلید	مولانا خورشید عالم قاسمی، افریقہ	
تاریخ کے جھرونکھے		۴۷
قیادت کا یہ منفی رویہ	مولانا فتح محمد ندوی، نئی دہلی	
وفیات		۴۹
سماجی کارکن ماسٹر محمد شاہد	مولانا محمد سلیم مظاہری، کھجناور	
فکروعمل		۵۰
اسلام اور تحفظ عصمت	مولانا محمد سلمان کبیر نگری	
آداب		۵۲
تلاوت قرآن کی عظمت اور اسکا احترام	مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری	
تبصرہ		۵۸
نئی کتابوں پر تبصرے	محمد مسعود عزیزی ندوی	

ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کے لئے شرح اشتہار

ٹائٹل صفحہ آخر رنگین	(فل سائز)	۳۰۰۰............
// // اول اندرونی	// //	۲۵۰۰............
// // آخر اندرونی	// //	۲۰۰۰............
صفحہ اندرونی	(فل سائز)	۱۰۰۰............
آدھا صفحہ اندرونی		۶۰۰............
¼ صفحہ //		۴۰۰............

◯ اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ اسی رسالہ کے ساتھ آپ کی سالانہ مدت خریداری پوری ہورہی ہے، لہٰذا آئندہ کے لیے جلد ہی زرتعاون مبلغ ۲۴۰؍روپئے ارسال فرمائیں، تاکہ رسالہ کو جاری رکھا جاسکے۔ (ادارہ)

نوٹ: شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت سہارنپور کو ہی ہوگا۔

پرنٹر پبلیشر: محمد فرقان نے لکشمی آفسیٹ پریس سہارنپور میں طبع کراکے دفتر ماہنامہ نقوش اسلام مظفرآباد سے شائع کیا

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر: مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور، یوپی (الھند)

ادار یہ

دعوت و تبلیغ

ضرورت، اہمیت، افادیت اور طریقہ کار

محمد مسعود عزیزی ندوی

دعوت وتبلیغ ایک عظیم کام ہے، یہ انبیاء علیہم الصلاۃ والتسلیم کی سنت ہے، انبیاء علیہم السلام اپنے پیروکاروں کی ہدایت ورہنمائی کی فکر میں کوشش کرتے رہے ہیں، ہر نبی اپنے متبعین کو اصول ہدایت، اصول زندگی اور راہنما طریقے بتاتا ہے، اور عملاً کر کے دکھاتا ہے، اور یہ کام انبیاء کی ایک کثیر تعداد نے کیا ہے، انبیاء اللہ تعالی کے فرستادہ ہوتے ہیں، اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے دی ہوئی ذمہ داری کو بخوبی انجام دیتے ہیں، انبیاء کی اس جماعت کا یہ مہتم بالشان اور عظیم کام نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے۔

❁❁❁❁❁ ———— ❁❁❁❁❁

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں، تو اپنی امت کی فکر میں کڑھتے ہیں، ہر طرح سے تگ ودو کرتے ہیں کہ میری پیاری امت جہنم کی آگ سے بچ جائے، اور ناکامی اور تباہی وبربادی کے راستے سے ہٹ جائے اور اسلام کی کامیابی والی زندگی اختیار کرلے اور ایک اللہ کی وحدانیت کے گن گانے لگے، اور ایسی زندگی گزارے جس سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت اور جدوجہد کی برکت سے ایسی ہستیوں کی ایک عظیم جماعت تیار ہوگئی جس کی برکت اور جدوجہد سے ایمان وعرفان کی ہوائیں چلنےلگیں اور یہ دنیا جنت نشاں بن گئی۔

❁❁❁❁❁ ———— ❁❁❁❁❁

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ عظیم ذمہ داری حضور کے صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور آنیوالے دیگر امتیوں کے سر پر آگئی، اس لئے ہر زمانہ میں اور ہر جگہ اللہ ورسول پر ایمان لانے والے، کتاب وسنت پر ایمان لانیوالے یہ کوشش کرتے رہے اور اس فریضہ کی دعوت وتبلیغ کرتے رہے، جس سے جگہ جگہ ایمان اور رشد وہدایت کی قندیلیں منور ہوتی رہیں، اور بھٹکتی انسانیت اور اس کی ڈانواڈول کشتی کو سہارا ملتا رہا اور یہ امت اپنے نبی اور اسلاف کے خطوط پر کام کرتی رہی، اور ترقی کرتی رہی اور پوری تاریخ اسلامی میں کوئی دور، زمانہ اور علاقہ ایسا نہیں ملتا جہاں پر دعوت وتبلیغ کا عمل نہ انجام دیا جارہا ہو، اور ملت اسلامیہ کے جانباز شب وروز جدوجہد نہ کررہے ہوں۔

❁❁❁❁❁ ———— ❁❁❁❁❁

اس لئے انسانی زندگی میں دعوت وتبلیغ کے عمل کی وہی حیثیت ہے جیسے جسم کے لئے غذا کی، کیونکہ جسم کو اگر غذا نہ ملے تو جسم سوکھ جائے گا، کمزور ہو جائے گا، خشک ہو جائے گا، اور موت کے دھانے پر پہنچ جائے گا، ٹھیک اسی طرح اگر دعوت وتبلیغ کا عمل ختم ہو جائے یا اس کو چھوڑ دیا جائے تو قوم خشک ہو جائے گی، ملت خشک ہو جائیگی، اور انسانی زندگی میں کمی واقع ہو جائے گی، اس لئے

اس کی ضرورت واہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

✿✿✿✿✿————————————✿✿✿✿✿

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی اور دعوت وتبلیغ کی ضرورت واہمیت کا اندازہ ہوگیا تو اس کے حامل یعنی دعوت وتبلیغ کے فریضے کوانجام دینے والے داعی حضرات وہ بھی اہم ہونے چاہئیں، یعنی اس عظیم کام کی باگ ڈورسنبھالنے والے ان پڑھ، جاہل، گنوار نہ ہونے چاہئیں، ورنہ تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی اناڑی ڈرائیوری سیکھے بغیر گاڑی چلانے کے لئے اسٹرنگ سنبھال لے اور گاڑی چلانی شروع کردے، اب آپ ہی خود اندازہ لگائیے کہ اس گاڑی کا اور اس میں سوار لوگوں کا کیا حشر ہوگا، اسی لئے جیسے گاڑی چلانے کیلئے ڈرائیور کا سیکھا ہوا ہونا ضروری ہے اسی طرح دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والے کے لئے بھی پڑھا ہوا، سیکھا ہوا، ہونا ضروری ہے، اگر ان پڑھ آدمی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے گا تو اس کا وہی حشر ہوگا جو اناڑی ڈرائیور کا ہوگا۔

✿✿✿✿✿————————————✿✿✿✿✿

آج کل جو لوگ تبلیغی جماعت سے جڑتے ہیں، اگر ان کی نیت سیکھنا ہے اور واقعتاً وہ سیکھ بھی رہے ہیں تو بہتر ہے، نہیں تو اگر کوئی آدمی جماعت میں سیکھنے کیلئے گیا اور کوشش کرنے لگا سکھانے کی، تو کیا حشر ہوگا، آپ خود سوچ سکتے ہیں، آج کل یہی ہورہا ہے کہ اگر کوئی آدمی جماعت میں چلا گیا، اب جماعت سے آ کر وہ سیکھے ہوئے لوگوں کو سکھانے لگا یا ان کو کمتر سمجھنے لگا، حالانکہ اگر جماعت میں جا کر اس نے دین سیکھ بھی لیا ہے، مسائل معلوم ہو گئے، فضائل معلوم ہو گئے، حلال وحرام معلوم ہو گیا، اللہ ورسول کے کچھ احکام معلوم ہو گئے، یہ چیزیں تو ہر مسلمان کیلئے سیکھنا ضروری تھی ہی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب آپ دوسروں کو سکھانے لگیں، اس لئے سکھانے اور دعوت وتبلیغ کے عمل کو ضروری تو سمجھا گیا، مگر اس کو فرض کفایہ کا درجہ دیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ فرض کفایہ سب کے ذمہ نہیں ہوتا، چند لوگ بھی کردیں تو وہ ادا ہو جائے گا، مگر اہمیت اس کی معلوم ہوگئی، اگر اس کو فرض عین قرار دیدیں تو امت تنگی میں پڑ جائیگی، اور تکلیف ہوگی، اس لئے کہ سب جاننے والے نہیں ہو سکتے، جب سب جاننے والے نہیں ہو سکتے تو سب دعوت وتبلیغ کرنیوالے نہیں ہو سکتے، یہ اہم نکتہ ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ عظیم کام انبیاء والا کام ہے، نبیوں والا عمل ہے، بھلا اس کو انجان اور ان پڑھ کیسے انجام دے سکتا ہے، اس کیلئے علماء کو کوشش کرنی چاہئے، باقی امت کے جو بڑی عمر کے لوگ ہیں، جو مدارس میں نہیں جا سکتے ان کو جماعت میں بھیجنا چاہئے، اور ان کی نیت کا قبلہ درست کرانا چاہئے کہ آپ کو سیکھنا ہے، سیکھنے کیلئے بھیجا جارہا ہے، سکھانے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ گاڑی کھڈے میں گر جائیگی، تو اسلئے علماء کی جماعت کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے، صرف درس وتدریس ہی نہیں بلکہ دعوت وتبلیغ کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھ میں لینی چاہئے اور ہاتھ میں تو ہے ہی، جب نبی پاک علیہ السلام نے دیدی تو اس کو کون لے سکتا ہے، مگر اس کو اور اپنی ذمہ داری کو سمجھنا ہے، اپنے مقام ومنصب کو سمجھنا ہے، یہ انبیاء کا مقام ہے، جو اس امت کے علماء کو اللہ نے دیا ہے۔

✿✿✿✿✿————————————✿✿✿✿✿

اس لئے تمام مسلمانوں سے، علماء سے بڑی محبت کے ساتھ، دل کی گہرائی اور تڑپ کے ساتھ عرض ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام جس طرح بھی ممکن ہو، جس طرح بھی آسان ہو، جو بھی طریقہ حالات کے مطابق ہو اس کو انجام دینا چاہئے، ہماری دعوت کے دو

میدان ہیں، ایک تو اپنے مسلمان بھائیوں کو اعمال صالحہ کی طرف دعوت دینی ہے، دوسرے غیر مسلموں کو ایمان کی طرف دعوت دینی ہے، دونوں میدان اہم ہیں، اکثر جگہ صرف ایک ہی طبقہ کو دعوت دی جارہی ہے، یعنی مسلمانوں کی تو دعوت دی جارہی ہے لیکن جو دعوت کے، اللہ کی طرف بلانے کے زیادہ مستحق ہیں اور بے ایمان اور غیر مسلم ہیں، ان کو دعوت نہیں دی جارہی ہے، حالانکہ وہ دعوت کے زیادہ حقدار ہیں، اس لئے دونوں طبقوں کی فکر ہونی چاہئے، دونوں کے لئے لائحہ عمل تیار ہونا چاہئے، اور عملاً اس کیلئے کوشش ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذمہ داری سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پھر دعوت وتبلیغ جب نبیوں والا کام ہوا، تو نبیوں والا کام کوئی بھی ایرا غیرا نتھو کھیرا کرنے لگے؟ حکمت کا کام تو حکیم کرے، ڈاکٹری کا کام ڈاکٹر کرے، انجینئری کا کام انجینئر کرے، کوئی دوسرا نہ کرے؛ لیکن نبیوں والا کام اس کو کوئی بھی کرے، یہ کتنی غیر ذمہ داری کی بات ہے، اس لئے اس کو بھی وہی انجام دیں، جو انبیاء کے وارث ہیں اور وہ علماء ہیں، اس لئے کہ داعی کی کچھ صفات وخصوصیات ہیں جو ان صفات سے متصف ہو وہی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے، ایسے کیسے ہوسکتا ہے، کوئی بے عمل ہے اور وہ دعوت کی بات کرتا ہے، کسی آدمی نے کسی کی دوکان، کسی کا مکان اور کسی کی جگہ دبا رکھی ہے اور وہ دعوت وتبلیغ کرتا ہے، کوئی بد اخلاق ہے، بدتمیز ہے اور وہ دعوت وتبلیغ کی بات کرتا ہے، کوئی چوری کرتا ہے، دوسروں کا حق دباتا ہے، اور وہ دعوت کی بات کرتا ہے، یہ سب غلط باتیں ہیں، داعی کے لئے جیسے جاننا ضروری ہے، عالم ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس کا باعمل ہونا بھی ضروری ہے، جو آدمی خود عمل نہیں کرتا اور دوسروں کو دعوت دیتا ہے، تو اس کی دعوت کا خاک بھی اثر نہیں ہوگا، کون مانے گا ایسے داعی کی بات، اس لئے داعی کا با اخلاق ہونا ضروری ہے، معاشرے میں اس کی عزت ہونا بھی ضروری ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے چالیس سال مکہ والوں کو اپنے اخلاق سے اتنا مؤثر کیا کہ وہ آپ کو صادق اور امین کہنے لگے، تب کار نبوت آپ کے سپرد ہوا، اور آپ نے دعوت کا کام شروع کیا اور آج کل کا معاملہ ایسا ہے کہ خود کی زندگی باعمل نہیں اور دوسروں کو دعوت دے رہے ہیں، ایسے داعی کی بات کون مانے گا، پہلے اپنے کردار سے، اپنے اخلاق سے، اپنے چال چلن سے، اپنے رہن سہن سے اچھا نمونہ پیش کیجئے، اچھا طرز زندگی پیش کیجئے، پھر دعوت دیجئے، تو آپ کی بات کا اثر ہوگا، آپ کی دعوت مثمر ہوگی، اور داعی کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس ماحول یا جن حالات میں دعوت دینا ہو، اس ماحول سے وہاں کے حالات سے واقف ہو، مدعو کی زبان سے واقف ہو، اگر مدعو کسان ہے تو اس کے سامنے کسانوں کی، کھیتی باڑی کی مثالیں دی جائیں، اگر مدعو ڈاکٹر ہے تو اس کی زبان میں، اس کی نفسیات کے مطابق بات کی جائے، انجینئر ہو تو اس کے سامنے اسی طرح کی بات کی جائے، یہ سب باتیں ہماری قرآن سے، حدیث سے اور حضور کی زندگی سے، اور صحابہ کے عمل سے معلوم ہوتی ہیں، مخاطب کی نفسیات اور اس کے ذوق سے واقف ہونا ضروری ہے، اگر وہ شہر کا ہے تو اس کے ساتھ شہر والی زبان استعمال کی جائے، اگر وہ دیہاتی ہے تو وہاں دوسرا لب ولہجہ اختیار کیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ داعی کی بہت ذمہ داریاں ہیں، اس کو بہت سلجھا ہوا اور سمجھدار اور صرف گفتار کا نہیں بلکہ کردار کا، عمل کا غازی ہونا چاہئے، امید ہے کہ پھر ان شاء اللہ ہماری دعوت مفید ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ ہمیں دعوت وتبلیغ کے اصول کو سمجھنے اور پھر دعوت وتبلیغ کا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری دعوت وتبلیغ کو مؤثر بنائے۔ ❑❑

یادرفتگاں

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ - کچھ یادیں کچھ باتیں

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

جنوبی ہند کے ایک سفر کے دوران ہندو پاک کے ذرائع ابلاغ سے یہ رنج دہ خبر ملی کہ علماء پاکستان کے سرپرست اور وفاق المدارس پاکستان کے صدر جامعہ فاروقیہ کراچی کے بانی وسرپرست حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اپنے مالک حقیقی کے دربار میں منتقل ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف بڑے ذی علم، علم نواز شخصیت اور دینی تعلیم کی عظیم درسگاہ جامعہ فاروقیہ کراچی کے مؤسس تھے، انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں اس زمانہ میں کی جبکہ وہاں وقت کے عظیم اصحاب علم اور جلیل القدر اساتذہ اور شیوخ حدیث موجود تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے جلیل القدر حضرات کی شاگردی ان کو حاصل ہوئی، پھر وہ اپنی تدریسی مشغولیت کیساتھ پاکستان منتقل ہو گئے، اور کراچی میں جامعہ فاروقیہ کے نام سے ایک اعلی دینی تعلیمی ادارہ قائم کیا، جس سے تعلیم وتربیت پا کر علماء کی کئی نسلیں علم دین کی خدمت کیلئے میدان عمل میں آئیں، بالآخر وہ اپنی مقررہ مدت عمر گزار کر مسافر آخرت ہوئے، مجھے ان کا تعارف اس وقت سے حاصل ہوا جب وہ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں تھے، اور وہاں کے شیخ الحدیث اپنے عہد کے ممتاز عالم اور قائد ومربی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تھے، جن سے اور دیگر اساتذۂ کرام سے وہ علمی ودینی فیض حاصل کر رہے تھے اور مجھ کو بھی یہ شرف حاصل ہو رہا تھا کہ شرائط دورہ کی دو ایک کتابوں میں وہاں درس حاصل کر رہا تھا، یہ زمانہ ملک کی تقسیم سے پہلے سن ۱۹۴۶ء کا تھا، ان سے تعارف کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ موصوف کو ان کے ذرائع سے میرے شفیق ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے تعارف ہو چکا تھا، چنانچہ میرے لئے کچھ مدت دارالعلوم دیوبند میں استفادہ کی رائے ہوئی، تو قیامگاہ میں دارالاقامہ کے تعلق سے ان کی رفاقت نصیب ہوئی، اس طرح اس تعلیمی مدت میں دارالاقامہ کی مرافقت ان کے ساتھ رہی، جس کی بناپر بہت قریبی تعلق اور ربط وضبط ہوا؛ لیکن بعد میں قیام کے بُعد اور ملکی فرق کے حائل ہونے پر تعلق زیر عمل نہ رہ سکا؛ لیکن ان کی علمی ودرسی مشغولیت سے وقتاً فوقتاً واقفیت حاصل ہوتی رہی اور ان کے جاری کردہ رسالہ ''الفاروق'' کے ذریعہ بھی جو ان کے قائم کردہ ادارہ سے برابر نکل رہا ہے، انکی علمی، دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں سے واقفیت کا موقعہ ملتا رہا۔

موصوف تھانہ بھون سے قریب قصبہ لوہاری کے رہنے والے تھے، اور وہیں کے قریبی مدرسہ ''مفتاح العلوم'' جلال آباد سے اپنی دینی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور مدرسہ کے ذمہ دار اعلی جلیل القدر ربانی عالم حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب شیروانیؒ خلیفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سرپرستی سے فیض بھی حاصل کرتے رہتے تھے، جو بعد میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے خصوصی فیض کی طرف منتقل ہو گیا تھا، مجھے دارالعلوم دیوبند کے درمیان سال ایک تعطیل میں ان کے وطن جانے اور اس تعلق سے ان کی رفاقت میں تھانہ بھون اور جلال آباد بھی جانے اور دیکھنے کا موقع ملا، اور اس خطہ میں حضرت تھانویؒ کے فیض کے آثار دیکھے، موصوف دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ملنے کئی بار لکھنؤ بھی آئے، ان سے وہ اپنی زمانہ طالب علمی سے ہی ایک ربط رکھتے اور انس محسوس کرتے تھے، یہ ربط میری وساطت سے بڑھا؛ لیکن ان کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد عملی طور پر اس کے ظاہر ہونے کا موقع بہت کم ہو گیا، البتہ ترکستان میں بخارا وسمرقند کی ایک علمی کانفرنس میں جو سید المحدثین حضرت امام بخاریؒ پر تھی اور اس میں حدیث کی مناسبت سے پورے عالم اسلام کی نمائندگی تھی وہ بھی تشریف لائے تھے، اس طرح ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی، اور بہت خوشی محسوس ہوئی تھی، ان کا اچھا علمی ودینی وزن تھا، اور ان کو اہل علم دین کے حلقوں میں بڑا احترام اور حیثیت حاصل تھی، اللہ تعالی انکی دینی وعلمی خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور انکی وفات سے برصغیر ہی میں نہیں عالم اسلام میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس میں اللہ تعالی نعم البدل عطا فرمائے اوران کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے ادارے کی حفاظت فرمائے۔

رھنمائے طلبہ

طلبہ تحریک میں تربیتی پہلو

انجینئر مصطفیٰ محمد طحان............ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی بھٹکل، کرناٹک

طلبہ کی تربیتی خصوصیات وامتیازات:

تربیت فطرت کے اعتبار سے انسانی، نفاذ کے اعتبار سے ذاتی اور شمولیت کے اعتبار سے معاشرتی کام ہے، وہ زندگی گزارنے کا طریقہ ہے یا خود زندگی ہے، آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک انسان اپنے بچوں اور نوخیز اولاد کی تربیت کا کام انجام دے رہا ہے تاکہ موجودہ زمانہ میں ان کی صحیح نشو ونما، اوران کی روحانی، جسمانی، جذباتی اور عملی ضروریات کی تکمیل میں تعاون کیا جائے اور روشن مستقبل کیلئے ان کو اپنی جماعت کے اراکین اور افراد کے طور پر تیار کیا جائے، تربیت ایک ضرورت ہے اور اس ضرورت کی تکمیل ضروری ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ ایک جسمانی ڈھانچہ کو ممتاز شخصیت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

ہم کس طرح تربیت چاہتے ہیں؟:

تربیت کی یہ اہمیت ہے اور طلبہ تحریک میں اس کو اولیت حاصل ہے تو سوال اٹھتا ہے کہ ہم کیسی تربیت چاہتے ہیں؟۔

عالم اسلام کو مشرق اور مغرب سے درآمد بہت سے تربیت کے طریقوں اور اسلوبوں کا کئی سالوں سے واسطہ اور تجربہ ہے، ان سے صالح نسلیں وجود میں آئیں، نہ امت کا مقام ومرتبہ بلند ہوا اور نہ امت اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ رہی، اسی وجہ سے عالم اسلام پر ضروری ہے کہ وہ اپنے اصلی سرچشموں، قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کی طرف لوٹ آئے، یہی راستہ ہر زمان ومکان کیلئے پائیدار اور صالح وبہترین اسلوب ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ تربیت کے دوسرے اسلوبوں کے مقابلے میں اسلامی تربیت کی کیا خصوصیات ہیں؟۔

۱- انسانی تربیت:

انسان اور حیات وکائنات کے اسلامی تصور پر مبنی اسلامی تربیت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسانی تربیت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کڑیوں کے تسلسل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال اس آدمی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا، اس کی تزئین وآرائش کی لیکن اس کے ایک کنارہ ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی، لوگ اس گھر کو دیکھنے کے لئے آتے اور تعجب سے کہتے: ''یہاں پر اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں''۔

ہر زمانہ اور ہر جگہ پر محیط، خدا کی مرضی اور فلاح انسانیت کو شامل تربیت ہے، اگر دوسرے تمام تربیت کے طریقوں اور اسلوبوں کا مقصد صالح شہری اور قومی ووطنی ثقافت کے علمبردار افراد تیار کرنا ہے تو اسلامی تربیت ایسا صالح انسان تیار کرتی ہے، جو فلاح انسانیت کا علم بردار ہوتا ہے۔

۲- کامل او رمتوازن تربیت:

مختلف تربیتی اسلوبوں نے انسان کے کسی ایک پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے، بعض اسالیب میں صرف جسم پر توجہ دی جاتی ہے، بعض صرف عقل پر توجہ دیتے ہیں، بعض روح کو توجہ کا مرکز بناتے ہیں، اور بعض میں صرف انسان کے نفسیاتی پہلو پر توجہ دی جاتی ہے، صرف اسلام ہی نے انسان کے وجود واحد میں نفس انسانی کی جسمانی، عقلی اور روحانی تمام پہلوؤں پر توازن کیساتھ یکساں توجہ دی ہے اور تمام انسان کی تمام صلاحیتوں کی آبیاری کی ہے اوران کے درمیان توازن قائم کیا ہے۔

۳- حقیقی تربیت:

انسان کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تربیت پر توجہ دی جاتی ہے، وہ نہ فرشتوں میں ہے اور نہ صرف حیوان ناطق ہے، اسلام دلچسپ چیزوں کے تئیں اس کی کمزوری کو جانتا ہے، اسی وجہ سے انسانوں کو ایسی چیزوں کا مکلّف نہیں بناتا جو اس کے بس میں نہ ہو، اوراس کو بلندی کی انتہا تک پہنچانا ہے، لیکن زندگی کی حقیقت سے غفلت نہیں برتی جاتی۔

٤- عملی تربیت:

تعمیری کام یا بلند اخلاق یا معاملات میں اس طریقے سے تبدیلی کی جاتی ہے کہ انسانی وجود کی اسلامی تصور کے مطابق تکمیل ہو جاتی ہے، اس میں صرف قول پر اکتفا نہیں کیا جاتا، بلکہ عمل، کوشش اور تعمیر ہوتی ہے۔

٥- مسلسل تربیت:

پوری زندگی مہد سے لحد تک یہ کام جاری رہتا ہے۔

٦- بتدریج تربیت:

ایک ہی ساتھ انسان کے پرانے اخلاق ذمیمہ کو اخلاق حسنہ میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ کام بتدریج اور وقفے وقفے سے ہوتا ہے۔

۷- اخلاقی تربیت:

اسلامی تربیت میں اخلاق کوئی تجارتی سامان نہیں ہے، بلکہ بلند اخلاق ایسی صفت ہے، جو انسان کے فکر وسلوک میں ممتاز خصوصیات کی جامع ہوتی ہے۔

۸- ایسی تربیت جس سے ضمیر زندہ ہوتاہے:

ضمیر ہی انسان کے بلند اخلاق کی طرف رہنمائی کا سب سے پہلا محرک ہے اور اسکو رذائل سے سب سے پہلے روکنے والا ہے، اسی وجہ سے اسلامی تربیت انسانی ضمیر کو زندہ کرنے پر توجہ دیتی ہے، جس سے انسان مخلوقات پر نظر رکھنے کے بجائے اپنے رب پر نظر رکھتا ہے اور دنیا کے بجائے آخرت میں بدلے کی امید رکھتا ہے، لوگوں کی طرف سے بدلے اور سزا کے بجائے دنیا وآخرت میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے، اسی وجہ سے خلوت وجلوت میں اس کے اعمال درست رہتے ہیں اور وہ معاشرے کا صالح جزء بنتا ہے اور اپنے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔

۹- ایسی تربیت جس سے ذوق جمال حاصل ہوتاہے:

خوبصورتی کا ذوق انسان کی بلند خصوصیات میں سے ہے، اسلامی تربیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کے ہر معیار کا ذوق وجمال حاصل کرے۔

طلبہ کی تربیت کے عناصر:

طالب علم کے معاشرے میں تربیت کے متعدد عناصر ہیں، جن کے ذریعے تربیت کے مقاصد اور اس کے مشمولات کی تکمیل ہوتی ہے، ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

۱- استاذ:

استاذ مرشد، رہنمائی کرنے والا اور معلم ہوتا ہے، اسی طرح وہ مربی اور قدوہ بھی ہے، استاذ کے کندھوں پر تربیتی میدان کی بڑی ذمہ داری رہتی ہے، جس طرح وہ تعلیمی کورس کی تکمیل کا ذمہ دار ہے، اسی طرح تربیتی مقاصد پورا کرنے کا بھی ذمہ دار ہے۔

استاذ پر ہر وقت طلبہ کی نگاہیں رہتی ہیں، وہ اس کی باتیں سنتے ہیں اور اس کو محفوظ کرتے ہیں، اسی وجہ سے استاذ اپنے قول وعمل اور ظاہری امور میں ان کا قدوہ اور آئیڈیل ہے۔

۲- طلبہ تحریک کے قائدین:

جس طرح استاذ کی تربیت کے میدان میں بڑی اہمیت ہوتی ہے، اسی طرح طلبہ تحریک کے قائدین اور سرگرم اراکین کا بھی اثر ہوتا ہے، ان پر طلبہ کی نگاہیں رہتی ہیں، طلبہ ان کی اقتدا کرتے ہیں، ان کے مشوروں پر چلتے ہیں اور ان کے ساتھی ان کو اپنا نمونہ بناتے ہیں، اسی وجہ سے طلبہ تحریک کے ذمہ دار اور قائدین کیلئے ضروری ہے کہ تربیتی کاموں میں قول کے بجائے عمل کر کے دکھائیں اور باتوں کے بجائے نمونہ پیش کریں۔

۳- تربیتی اسلوب:

دنیا کے بہت سے تعلیمی اداروں کے تربیتی اسلوبوں میں بڑی

خامیاں پائی جاتی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ادارے علمی نصاب اور تحصیل علم پر تو توجہ دیتے ہیں لیکن تربیتی کاموں کو انفرادی کوششوں اور ذاتی جدوجہد کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔

اسی وجہ سے طلبہ تحریک میں کام کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ تربیتی اسلوبوں کی تحقیق کریں اور معاشرے پر ان کے اثرات کا جائزہ لیں اور ان کے نفاذ کیلئے مناسب منصوبے بنائیں، چاہے طلبہ کی جماعتوں میں ان کا نفاذ ہو یا طلبہ تحریک کے داخلی میدان میں، پھر ان کی نگرانی کریں اور ان کا جائزہ لیتے رہیں۔

تربیتی اسلوب کا ہمارے دین، ہمارے معاشرے کی پختہ قدروں اور ہمارے مستقبل کے واضح پروگرام کے مطابق ہونا چاہئے، اسی طرح اسلوب کا کامل ہونا بھی ضروری ہے، جس میں تربیت کے کسی پہلو یا بنیاد کو چھوڑا نہ گیا ہو، بلکہ ان تمام امور کو ملحوظ رکھا گیا ہو، اس کے ساتھ ساتھ اسلوب کا عملی ہونا بھی ضروری ہے، جس میں نظریات کے ساتھ نفاذ کا پروگرام بھی واضح ہو۔

٤- عملی تربیت:

عملی تربیت طلبہ برادری جیسے معاشرے کی اہم اکائی میں تربیتی کاموں کی خصوصیتوں میں سے ہے، جو متحرک وسرگرم اور نئی چیزوں کی تلاش میں رہنے والا معاشرہ ہے، جس میں روزانہ نئے رموز سامنے آتے ہیں، کام اور سرگرمیاں رہتی ہیں، اس طرح کے سرگرم اور فعال معاشرے میں روزانہ نئے واقعات رونما ہوتے ہیں اور طلبہ کی مختلف سرگرمیوں سے استفادہ کیا جاتا ہے اور معاشرے کے ساتھ مختلف عناصر کی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، جس سے عملی تربیت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، ان تمام چیزوں سے استفادہ تربیتی کاموں کے مفاد میں ہوتا ہے، اسی کے ذریعے عملی موقعوں پر اصول اور قدریں پختہ، ہمتیں بلند اور معانی افکار مضبوط ہوتے ہیں، جن کا طالب علم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس ماحول میں رہتا ہے اور ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے، اسی وجہ سے معاشرے پر اس کا اثر زیادہ اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

۲- افکار اور نظریات میں ہم آہنگی:

طلبہ تحریک ایک قائدانہ کام ہے، امت کے مسائل کو مکمل طور پر سمجھتا ہے اور امت کے مفادات کیلئے ہر مثبت کام میں پیش پیش رہتا ہے، اسی وجہ سے اس پر توجہ دینا، اس کی اصلاح ودرستگی کی فکر کرنا اور اس کی رہنمائی کرنا ضروری ہے، ہمیشہ سے یہی ہوتا آرہا ہے کہ کام پختہ افکار ونظریات کے ذریعے وجود میں آتے ہیں، جو کام کرنے والوں کی صحیح سمت اور اسلوب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، ہر بگاڑ کی اصلاح ودرستگی اور ہر کوتاہی اور کمی کو پورا کرتے ہیں۔

لیکن زمان ومکان کے اعتبار سے طلبہ تحریک کے بہت زیادہ وسعت، دنیا کے مختلف گوشوں اور مختلف نسلوں میں طلبہ جماعتوں کے پھیلاؤ اور اسی کے ساتھ کام کرنے والی جماعتوں کے مابین تعلقات بنانے میں دشواری کی وجہ سے خیالات اور اصطلاحات میں اختلاف اور افکار ونظریات میں تنوع پایا جاتا ہے، یہی تضاد اور اختلافات عالمی سطح پر طلبہ تحریک کے لئے حقیقی خطرہ بن گیا ہے۔

اس اہم کام میں علاقائی طریق اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے، جو اجتہاد کبھی صحیح ہوتا ہے تو کبھی اس میں غلطی بھی ہوتی ہے، یا ان ناپختہ تجربات کی کوئی گنجائش ہوتی ہے، جو کبھی کامل صورت پیش کرتے ہیں تو کبھی اس میں خامیاں باقی رہتی ہیں، یہ سب اس لئے کہ طلبہ تحریک کے بنیادی افکار ونظریات کی مختلف تشریحات نہ کی جائیں، کیونکہ اس سے اختلاف پیدا ہوتا ہے، اور اس کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے، اسی وجہ سے کارکنان کے درمیان بنیادی افکار ونظریات اور استعمال کئے جانے والے الفاظ، اصطلاحات اور اقوال کی واضح تعریفات میں اتفاق پیدا کرنا ضروری ہے، جس کو تمام لوگ مختلف جماعتوں، معاشروں اور ماحول کے اعتبار سے مختلف شکلوں میں سمجھ سکیں۔

نظریات اور افکار میں یکسانیت پیدا کرنیوالے اقدامات:

افکار ونظریات میں یکسانیت پیدا کرنے کا کام متعدد طریقوں سے مرتب ومنظّم اقدامات کے ذریعہ انجام پاتا ہے، جو ایک دوسرے سے

مربوط رہتے ہیں، اس میدان میں کام کرنے والوں کیلئے اس کی رعایت کرنا ضروری ہے، ہم نے دنیا کے مختلف گوشوں میں طلبہ تحریک میں کام کرنیوالوں کے درمیان افکار ونظریات میں اتفاق پیدا کرنیوالے ہمارے اس کام میں ان اقدامات کی رعایت رکھی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک اقدام کو بہترین طریقے سے مکمل کرنے کی کوشش کی ہے، عام فائدہ کیلئے ہم یہاں ان اقدامات کو تفصیل کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

پہلا اقدام- ان افکار کی تعیین جن میں اتفاق پیدا کرنا ہے:

پہلے ان افکار کو جمع کیا جاتا ہے جن کو سمجھنے میں اختلافات ہوتے ہیں اور جو طلبہ تحریک کے بنیادی عناصر ہیں، ان اقدام کی تکمیل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مختلف نسلوں میں طلبہ تحریک پر توجہ دینے والوں اور طلبہ کی ایک یا ایک سے زائد نشستیں منعقد کی جائیں، افکار کو جمع کرنے کے لئے اوپن مناقشے اور تبادلہ خیال کی مجلسوں اور نشستوں کا انتظام کیا جائے، پھر جن اہم افکار میں کارکنان کے درمیان یکسانیت پیدا کرنا ضروری ہے ان افکار کی فہرست تیار کرنے کے لئے مسلسل جائزہ لیا جائے اور ان کو مرتب کیا جائے۔

دوسرا اقدام-اولیت اوراھمیت کے اعتبار سے افکار کی تحقیق وتلاش:

جن افکار ونظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے ان کی فہرست تیار کرنے کے بعد طلبہ تحریک کے میدان میں کام کرنے والوں کی تحریک اور فکر پر اثر اندازی اور ہر فکر کی اہمیت کے اعتبار سے ان کو مرتب کیا جانا چاہئے، پھر اس کے بعد اہمیت کے اعتبار سے ہر فکر کی تحقیق کی جانی چاہئے، ہم ہر فکر کی خصوصیت اور اہمیت کے اعتبار سے اس کے تحقیقی وسائل میں تنوع اختیار کر سکتے ہیں، یہاں پر ہم افکار و وسائل کی تحقیق کے بعد اسالیب کو اختصاراً بیان کر رہے ہیں:

مناقشہ وتبادلہ خیال کی نشستیں: کسی بھی تحقیق کی جانے والی فکر کے سلسلے میں ایجنڈا تیار کیا جائے اور طلبہ تحریک سے منسلک بعض افراد اور چند اصحاب الرائے لوگوں میں اس کو تقسیم کیا جائے اور اس فکر پر مناقشہ کرنے کے لئے ایک یا ایک سے زائد نشستوں میں ان تمام افراد کو مدعو کیا جائے، پھر اس فکر کو از سر نو تیار کیا جائے۔

کسی کتاب یا کتاب کے کسی جزء پر اعتماد کیا جائے، یکسانیت پیدا کئے جانے والی کسی فکر سے متعلق کتابوں کو پڑھا جائے اور اس کے اقتباسات کا انتخاب کیا جائے، یا کسی ایک کتاب یا اس کے کسی جزء کا انتخاب کیا جائے، اس میں مولفین کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔

ماہرین سے رجوع کرنا: تحقیق کئے جانے والے موضوع کے سلسلے میں کسی ماہر کے ساتھ بات کی جائے اور اس کے ساتھ مل کر مناقشے کا عمومی خاکہ تیار کیا جائے، اور اس کام کو پورا کرنے کیلئے اس کی خدمات حاصل کی جائے، M.A اور P.H.D کے مقالات: جن موضوعات پر تحقیق کرنی ہے، ان کے سلسلے میں تدریسی عملہ کے اراکین کے ساتھ گفتگو کی جائے اور ان کے تحقیقی منصوبوں میں ان موضوعات کو شامل کیا جائے اور M.A اور P.H.D میں پڑھنے والے طلبہ کے ذریعہ ان کو تیار کیا جائے۔

مقابلے: جن موضوعات پر تحقیق کرنی ہے، ان میں مقالے کا اعلان کیا جائے پھر پیش کردہ مقالات کو جانچا جائے اور ان میں سے بہترین مقالوں کا انتخاب کیا جائے۔

تیسرا اقدام: لٹریچر کی تیاری اوراس کی تقسیم:

صرف ایک فکر اور خیال کو الگ سے یا کئی متقارب افکار کے تحقیقی نتیجے کو ایک ساتھ ماحول اور معاشرے کے مطابق کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور اشاعت کی شکلوں میں تنوع کا خیال رکھا جائے، تاکہ طلبہ کے میدان میں کام کرنے والوں اور اس پر توجہ دینے والوں کی بڑی تعداد تک اس کو پہنچایا جائے، اشاعت کی شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:

کتابیں اور پمفلٹس: "اتحاد المنظمات الطلابية" (S.O.U) نے افکار ونظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کتابی سلسلہ شروع کی ہے، اس میں ان اہم افکار ونظریات کو شامل کیا ہے جن نظریات میں طلبہ کے میدان میں کام کرنے والے تمام افراد کے درمیان یکسانیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

آڈیواور ویڈیو کیسٹ: اس کو آسانی کے ساتھ تقسیم کیا اور پھیلایا جاسکتا ہے، تمام لوگوں کے لئے اس کا سننا آسان ہوتا ہے اوران افکار کو بہترین اورآسان شکل میں پہنچایا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر پروگرام اور سی ڈیس: انٹرنیٹ اورخصوصاً طلبہ کے ویب سائٹ کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ان افکار کو منتقل اورارسال کیا جاسکتا ہے: ''اتحاد المنظمات الطلابیة" S.O.U کا ویب سائٹ Www.students-online.ws ہے۔

محاضرات، جلسے اور مناظرے: یکسانیت پیدا کئے جانے والے نظریات وافکار کو محاضروں، جلسوں اور مناظروں میں شامل کیا جاتا ہے اوراس سے بہترین نتائج اور فائدے حاصل کئے جاتے ہیں۔

تربیتی کورسس: تربیتی کورسس تیار کئے جاتے ہیں اوران کو طلبہ کے میدان میں کام کرنیوالوں کے تربیتی پروگرام میں شامل کیا جاتا ہے۔

جن علاقوں میں افکارونظریات میں یکسانیت پیدا کرنا ہے، وہاں ان اشاعتوں کی تقسیم اوراس طرح کی میٹنگوں کو منعقد کرنے کے لئے فوراً منصوبہ بنانا طلبہ تحریک کے ساتھ منسلک لوگوں کے لئے ضروری ہے، اسی طرح کارکنان کا ان تحقیقات سے استفادہ کرنا اورمفہوم وفکر کی مناسبت اور علاقے کے حالات کے اعتبار سے تمام کارکنوں اور طلبہ میں لٹریچر پہنچنے کے بارے میں یقین حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

چوتھا اقدام: جائزہ اور نگرانی:

یہ ضروری اقدام ہے، اس سے مفر نہیں، پروگرام اور منصوبہ کے نفاذ کی نگرانی اوراس کا جائزہ لینا اور مطلوبہ مقصد کے حصول میں استعمال کردہ وسائل کی صلاحیت کا اندازہ لگانا ضروری ہے، جائزہ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ غلط افکارونظریات کی تصحیح کرنے اور بامقصد نظریات میں یکسانیت پیدا کرنے کے کام کی تکمیل کا فیصد نکالا جائے۔

اس موضوع پر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ: سلسلہ توحید المفاہیم کے عنوان کے تحت کتابوں کا سلسلہ شائع کرنے میں "اتحاد المنظمات الطلابیة" (S.O.U) نے پہل کی ہے، جن نظریات میں کام کرنے والوں کے درمیان یکسانیت پیدا کرنا ہے ان کو چار خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں سے ہرایک کئی افکارونظریات پر مشتمل ہے۔

(۱) دعوتی افکار ونظریات:

حق وباطل کے درمیان کشمکش: اللہ کے کائناتی قوانین کی تحقیق کی جائے تاکہ حق وباطل کے درمیان مقابلہ کیا جاسکے اوران قوانین کو نیک کاموں کیلئے مسخر کیا جائے، امت کی بیداری میں نوجوانوں کا کردار۔

شوری: اس کی اہمیت، میدانات اوراس کے نئے انطباقات۔

دعوت: اس کے مراحل، مقاصد، اسالیب اوراس کی راہ میں آنے والی روکاوٹیں، معاشرے میں عورت کا کردار۔

(۲) تربیتی افکار ونظریات:

تبادلہ خیال اورمناقشے کے آداب: محبت والفت میں بگاڑ آئے بغیر ہم کس طرح تبادلہ خیال کریں؟۔

تبدیلی: ہم اپنی ذات اورمعاشرے میں بہترین تبدیلی کس طرح لائیں؟۔

محبت: طاقت کو ابھارنے اورافراد ومعاشرے میں حرکت پیدا کرنے کا عظیم جذبہ ہے۔

قدوہ ونمونہ: دعوت اورتبدیلی کا پہلا ذریعہ ہے۔

شخصیت کی ترقی: ذمہ داری کا احساس، جذبہ پیدا کرنیوالی چیز کا وجود اپنی ذات سے واقفیت، اس کے ساتھ بہترین طریقے سے پیش آنا اوراس کو ترقی دینے کی کوشش کرنا۔

(۳) انتظامی افکار ونظریات:

وقت کا صحیح استعمال۔ انتظامی کام۔ قیادت۔
جلسوں کا انتظام۔ ادارہ سازی۔

(٤) سیاسی افکار ونظریات:

بیت المقدس۔ اسلامی مملکت۔ متعددافکار۔
آفاقیت۔ اقلیات۔ جماعتی کام۔

شخصیات

چوں رابع مربی ندیدم کسے

قصہ ایک انسان اور انسان ساز کا

مولانا محمد اکرم ندوی آکسفورڈ یونیورسٹی، یوکے

بسر بردم ایام با ہر کسے
چوں رابع مربی ندیدم کسے

راویان عدالت شعار، وناقلان صداقت آثار کا بیان پر از ایقان وخالی از وہم وگمان ہے کہ سات سمندر پار اور ہزاروں میل دور کشور ہندوستان میں نوابوں کے پرستان سے پرے شہر رائے بریلی کے پچھّم میں سئی ندی کے کنارے آج سے تقریباً چار سو سال پہلے ایک کیمیا گر جس کا دل آئینہ چینی سے زیادہ روشن وتابندہ تھا اور جس کی خاک پا میں ساغر جم سے زیادہ صفا تھی وارد ہوا، بنجر وغیر آباد زمین، نہ کوئی مکان، نہ کوئی مکین، کیمیا گر نے سوچا کہ کس طرح اسے سرسبز وشاداب بنائے، رشک قرن وختن اور محسود بدخشاں ووادی زرفشاں بنائے، اس کا دل فکر مند تھا اور نگاہیں پریشان، کہ اسے ایک روز ایک اکسیر کا نسخہ ہاتھ آ گیا، یہ نسخہ دشوار اور صبر آزما تھا، لیکن حوصلہ مند اور ثابت قدم کیمیا گر نے ہمت نہ ہاری: ؎

طلب گار باید صبور وحمول
کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

یہ انسان گری وآدمیت سازی کا نسخہ تھا، اس میں علم وعمل، قلب ونظر، عقل ودانش اور عشق ومحبت کے اجزاء کی آمیزش تھی، اس مرکب کا استعمال کرنا تھا کہ قرن کے اویس صفت انسان عالم وجود میں جلوہ افروز ہوئے، جو مشک ختن سے زیادہ خوشبودار، لعل بدخشاں سے زیادہ قیمتی، اور وادی زرفشاں سے زیادہ کرم گستر وفیض رساں تھے، اور دیکھتے دیکھتے یہ سرزمین مثال ارم وجنت نظیر بن گئی۔

تمتع بہ ہر گوشہ اے یافتم
ز ہر خرمنے خوشہ اے یافتم

چو پاکان شیراز خاکی نہاد
ندیدیم کے رحمت براین خاکباد

تولائے مردان ایں پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام وروم

یہ نسخہ اس کیمیا گر کے گھر میں نسلاً بعد نسل اور قرناً اثر قرن منتقل ہوتا رہا، اس وقت اس کیمیا گر پاک طینت وخرم نہاد کے جانشین برحق اور وارث نعم البدل مخدوم ومعظم واستاد محترم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ہیں، انسان، انسان گر وآدمیت ساز، اس دنیا میں انسان کم، مگر دیوہائے انسان نما بہت ہیں، اور صورت آدم میں فرزندان آدم فراواں:

نہ ہر کہ چشم وگوش ودہان دارد آدمست
بس دیورا کہ صورت فرزند آدمست

یہ سخن حکیمانہ جہاندیدہ وگیتی نورد شیخ شیراز کی طرف منسوب ہے، قونیہ کا مرد دانا وحکیم فرزانہ ہاتھ میں چراغ لیکر روز روشن میں زیر فرمان مہر عالم آرا وجہانتاب انسان کی تلاش میں کوچہ وشہر میں پھرتا رہا، صحراء وبیابان میں گرداں رہا، ناکامی اس کا مقدر رہی، پر تلاش جاری رہی: ؎

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو ودد ملولم وانسانم آرزوست

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ان سطروں میں جس کیمیا گر کا بیان ہے وہ ایک انسان ہے، آدم صورت وآدم معنی، اوراس نے اپنے ہنر اعجاز نما سے ''آنکہ یافت می نشود'' کو ''یافت می شود'' بنادیا ہے، یہ اس کی صحبت کا اثر اور مسیحائی کا کرشمہ ہے کہ اس کے مرز وبوم اور مسکن پر یزدان میں اس کے ہنر کے طلبگاروں کا ہجوم ہے اور متاع انسانیت کے خریداروں کا اژدحام، اس کیمیا گر ہمایوں نژاد وکروبی صفت نے زماں ومکاں کی تنگیوں کو خیر باد کہہ کے ایک نئے عہد کی بنیاد رکھی ہے۔

اسکی زمین بے حدود اس کا افق بے شغور

اسکے سمندر کی موج دجلہ ودنیوب ونیل

اسکے زمانے عجیب اسکے فسانے غریب

عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل

ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق

بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اسکی اصیل

آپ کے مناقب کی داستان لمبی ہے، اور علم وفضل کی تفصیل طولانی، آپ کے قرآن کریم کے دروس سے ایک عالم بہرہ مند وفیضیاب، حدیث نبویؐ کی تعلیم سے سنتوں کا بول بالا اور بدعات کا زوال، آپ دربار عربی زبان وادب کے مسند نشین ''منشورات من ادب العرب'' آپ کے حسن انتخاب اور پاکیزگی ذوق کی دلیل ''الادب العربی بین عرض و نقد'' عربی ادب کی نشو وارتقا کی تاریخ پر آپ کی گہری نظر کی شاہد، اور آپ کے تنقیدی شعور کی گواہ، نظریہ تعلیم وتربیت کے میدان میں قدیم وجدید کی خوبیوں کے حامل مکتبہ فکر کے بانی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے بین الاقوامی ادارہ کے ناظم وسرپرست، مسلم پرسنل لابورڈ جیسی بین الملکی تنظیم کے صدر اور بحر پر آشوب میں اس کی کشتی کے ملاح پر عزم، ان میں سے ہر پہلو آپ کے کمالات یکتا کا بیان، ان میں سے ہر وصف کا ایک عالم معترف وقدرداں، یہ مختصر تحریر ان خوبیوں کے ذکر کی متحمل نہیں، اوران کمالات کے لئے اس کا دامن تنگ ہے، تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل، آپ پر کس قدر صادق ہے، سفیان ثوری کا وہ قول جو انہوں نے خلیل بن احمد الفراہیدی کے متعلق فرمایا تھا: ''من أراد أن ینظر إلی رجل من ذهب و مسك فلينظر الى الخليل''۔

شبّهته البدرلكن ليس يشبهه

فذا يغيب و هذا قط ما أفلا

یہاں آپ کے وصف انسانی وانسان گری کی تصویر کشی ہے، آپ کا ملفوظ گرامی ہے: ''اگر ہم انسان بھی جانوروں کی طرح زندگی گزاریں اوران کی طرح کھاتے پیتے رہیں، تو پھر ہم میں اوران میں کیا فرق رہا''۔ (افضل انسان صفحہ۱۲)

اس انسانیت کیلئے آپ کا اسوہ انسان کامل، رہنمائے انسانیت اور محبوب خداوندی ذی المنن صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''آپ کی حیات مبارکہ میں انسانی رفعت وعظمت کے حصول کا بہترین نمونہ اور مکمل نظام موجود ہے'' یہ ''اسوہ رسول انسانی زندگی کا کامل اور ہمہ گیر دستور حیات قرار پایا ہے، اگر انسان اس کو اختیار کرے تو اسی رفعت وعظمت اور شرافت وعزت کو حاصل کرسکتا ہے، لیکن اگر اس نے اس سلسلہ میں کوتاہی کی اور خواہش نفسانی کو ترجیح دی تو اس سے یہ مقام بلند حاصل نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوجاتا ہے، اور وہ حیوانیت اور درندگی پر اتر آتا ہے''۔

رہا نہ کچھ بھی زمانہ میں جب نظر کو پسند

تری نظر سے کیا رشتہ نظر پیوند

تواضع:

تواضع ایک عظیم جوہر انسانی ہے، جو جسم تواضع سے عاری وہ انسانیت سے خالی ہے، فروتنی طینت بشری ہے، اور مقتضائے خلقت آب وگل، آپ کے اندر یہ وصف نمایاں ہے اور بے پایاں، فخر کا گزر نہیں، کبر وبرتری کے شائبہ سے پاک، سادہ لباس، تکلف سے بری علم

وفضل کے بار سے سر جھکا ہوا، نگاہ پست، چھوٹوں اور طالب علموں سے بھی گفتگو کے وقت کلام میں گداز ونرمی، زبان میں حلاوت وشیرینی:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

اگر کوئی فروگزاشت ہوجائے تو ادنی طالب علموں سے بھی معذرت کرتے نہیں جھجکتے، جو واقعہ سنانے جارہا ہوں اگر اس میں آپ کے فضل کی دلیل پنہاں نہ ہوتی تو اسے ہرگز سپرد گوش قلم نہ کرتا، ایک مرتبہ زیر درس کتاب کی کسی عبارت پر راقم نے کوئی نحو یانہ اشکال کیا، آپ نے اس کی توجیہ فرمائی، ہم طلبہ کے خیال میں بات ختم ہوگئی تھی، لیکن اسی دن ظہر کی نماز کے بعد راقم کو بلا کر فرمایا کہ تمہارا اشکال صحیح تھا، قربان جایئے اس تواضع کے، قربان جایئے اس مربیانہ ومشفقانہ انداز کے، یہ مختصر قصہ فن تعلیم وتربیت کے صفحات پر بھاری ہے۔

بار بار کا مشاہدہ ہے کہ اپنے سے علم وفضل میں کمتر لوگوں کو آگے کردیتے ہیں، ان کے لئے اپنی جگہ خالی کردیتے ہیں، مقام اعزاز واکرام میں انہیں ترجیح دیتے ہیں، جس کی وجہ سے کم ظرفوں کو اپنے حقیقی مقام کی تعیین میں غلطی ہوجاتی ہے، بقول حالی شائستہ اطوار:

ہم نے ہر ادنی کو اعلی کردیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

صبر:

تکلیف دہ اور ناگوار باتوں کا خوشدلی سے برداشت کرلینا صرف اولوالعزم انسانوں کا کام ہے: "وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم" یہی وہ خوبی ہے جس پر قیادت وسربراہی منحصر: "وجعلنا منه ائمة يهدون بأمرنا لما صبروا" اور یہی وہ وصف عظیم ہے جس کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کو امامت الناس کا منصب عظیم عطا ہوا: "وإذابتلى ابراهيم ربه بكلمات فاتمهن قال انى جاعلك للناس اماما"۔

صبر وتحمل میں آپ نے وہ مثالیں قائم کی ہیں جن کا تصور ممکن نہیں، آج جب کہ بے صبری کی وجہ سے گھروں کے اندر جنگ کا ماحول ہے، تعلیمی، تربیتی، اجتماعی اور سیاسی ادارے برباد ہورہے ہیں، خونی رشتے ٹوٹ رہے ہیں، دوستوں کے تعلقات متاثر ہورہے ہیں، بڑے اور چھوٹے کی تمیز مٹ رہی ہے، معمولی معمولی باتوں کو لوگوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے، اس صورت حال میں پہاڑوں سے زیادہ پائیدار آپ کا صبر وتحمل، قندیل رہبانی اور ستارہ قافلہ کنعانی ہے، ایک بار میں نے کسی مشہور شخصیت کی شکایت کی کہ وہ حضرت مولانا کے متعلق نازیبا کلمات استعمال کرتے ہیں، آپ نے مجھے صبر کی تلقین کی اور خود اپنا واقعہ سنایا کہ ایک صاحب (آپ نے ان کا نام نہیں لیا) نے میری موجودگی میں میرے لئے یہ لفظ استعمال کیا (آپ نے اس لفظ کا مجھ سے تذکرہ کیا لیکن وہ لفظ اتنا سخت ہے کہ میرے اندر اس کے نقل کی ہمت نہیں) اور میں نے کچھ نہیں کہا:

قائل ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

اس واقعہ کے سننے کے بعد راقم نے طے کیا کہ کوئی کچھ بھی کہے صبر کرنا ہے، اور اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لینا ہے، جعفر بھائی نے مجھ سے یہ واقعہ سنایا کہ ایک صاحب جو آپ کے سامنے بچے رہتے ہیں، آپ کی غیر موجودگی میں آپ کا مذاق اڑا رہے تھے، میں نے اس کا تذکرہ آپ سے کیا تو فرمایا کہ جعفر تمہاری زبان تیز ہوگئی ہے، تمہیں قیامت میں اس کا حساب دینا ہوگا، جب جعفر بھائی نے مجھ سے یہ واقعہ سنایا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور اس بلندی وعظمت پر فدا ہونے کو دل چاہا، وللہ در ابی عمرو بن العلاء۔

شاتمنى عبدبنى مسمع ، فصنت عنه النفس والعرضا
ولم اجبه لاحتقار ى له، ومن يعض الكلب ان عضا

حلم:

خواہشات کو قابو میں رکھنا، غصہ کو زیر کرنا، جذبات سے مغلوب نہ ہونا، فیصلہ کرنے میں جلد بازی نہ کرنا انسان کے وفور عقل، قوت فکر اور

سمجھداری کی دلیل ہے، حلم کا وفور عقل، اصابت رائے، پختگی ارادہ اور قوت عمل سے گہرا تعلق ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے آیت قرآنی میں :"وبشر ناه بغلام حليم"۔

اذا شئت يوم ان تسود عشيرة

فبالحلم سدلا بالتسرع والشتم

وللحلم خير فاعلمن مغبة

من الجهل الاان تشمس من ظلم

بچپن سے آپ اس علمی ذہانت سے متصف تھے، استاذ محترم مولانا واضح رشید ندوی نے یہ واقعہ مجھے سنایا کہ عربی کی ایک ابتدائی کتاب کا درس مولانا محمد عمران خان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا، مولانا نئے نئے ازہر شریف (مصر) سے فارغ ہوکر آئے تھے، درجہ میں عربی میں بات کرنے کی مشق کراتے، وقت کی پابندی کرتے اور اپنے اصول میں سخت گیری کرتے، استاد محترم (مولانا واضح صاحب) ایک روز لیٹ ہوگئے، ڈر تھا کہ مولانا عمران خان سختی سے تاخیر کی وجہ پوچھیں گے، اس لئے اپنے بھائی مولانا رابع صاحب سے پوچھا کہ کیا کریں، آپ نے فرمایا کہ تم کہنا "أخرتني الساعة" درجہ میں پہنچے تو مولانا عمران خان صاحب نے پوچھا ''ما اخرک؟'' عرض کیا: ''اخرتني الساعة'' ایک نوعمر طالب علم سے اتنی فصیح عربی سن کر سارا غصہ کافور ہوگیا۔

اس وفور عقل نے حلم کی صفت آپ میں بڑھادی ہے، ندوہ کی طالب علمی سے لیکر اس وقت تک میرے علم میں شخصی زندگی، اجتماعی زندگی، اور انتظامی امور کے بے شمار ایسے مواقع ہیں جہاں آپ نے اپنی حکمت اور سمجھداری کی وجہ سے جذباتیت کو قریب نہیں آنے دیا، جب کہ کتنے لوگوں کو ایسے مواقع پر پھسلتے دیکھا ہے، اور بعضوں کو بعد میں کف افسوس ملتے دیکھا ہے، میرے علم میں کوئی ایسی مثال نہیں جب کہ آپ نے جذبات سے مغلوب ہوکر جلدی میں کوئی فیصلہ لیا ہو اور بعد میں افسوس کرنا پڑا ہو، آپ کا یہ وہ نمایاں وصف ہے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل یا تردد نہیں کہ اس میں آپ حضرت مولانا علیہ الرحمہ سے بھی فائق ہیں، بلکہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ مشکل امور میں حضرت مولانا آپ سے رائے لیتے تھے، کبھی کبھی آپ کی رائے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعض قریبی ساتھیوں سے مختلف ہوتی تھی، اس وقت بھی حضرت آپ کی رائے پر عمل کرتے تھے، میرے علم میں بعض نمایاں لوگوں کے واقعات ہیں کہ انہوں نے جلدی میں فیصلے کئے، بعد میں ان فیصلوں سے تلخیاں پیدا ہوئیں، لیکن آپ ان ہنگامی لمحات میں بھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے، شاید اس وصف میں آپ اپنے دوسرے ماموں ڈاکٹر حکیم عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قریب اور مشابہ تر ہیں۔

خود میرا ایک واقعہ ہے کہ میں نے ایک فیصلہ لیا جس کا نتیجہ صحیح نہیں نکلا، مجھ سے بعد میں فرمایا کہ میرے دل میں آیا کہ تم کو اس فیصلہ سے روکوں، لیکن یہ سوچ کر نہیں روکا کہ تم اس وقت میری بات نہیں سنو گے، موقعوں کی نزاکتوں کا یہ خیال اس وقت صرف آپ کا حصہ ہے، شاید بعض لوگوں کو مبالغہ معلوم ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ راقم نے ہندوستان اور عالم عرب میں بلکہ مشرق ومغرب میں آپ کی طرح کوئی حلیم الطبع اور بردبار شخص نہیں دیکھا، اور جذبات سے عدم مغلوبیت اور عقل وفکر کی تحکیم میں راقم کو اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا انسان نظر نہیں آیا:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت

ہم جہاں میں تیری تصویر لئے پھرتے ہیں

صفائے قلب ومحبت:

آپ کی ایک اہم خوبی دل کی صفائی ہے، میں نے زمانہ طالب علمی سے دیکھا ہے کہ آپ ہمیشہ ندوہ کے انتظام وانصرام میں پیش پیش تھے، اس لئے کبھی کبھی بعض لوگ آپ کے فیصلوں سے شاکی رہتے، لیکن آپ نے اپنا دل ہمیشہ صاف رکھا، اور قدرت کے باوجود انتقام نہیں لیا:

آئین مااست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

آپ کا دل محبت سے لبریز ہے اور اسی لئے آپ کی عظمت و بزرگی کی عمارت قائم و پائیدار ہے: ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

میرے ساتھی اور جن لوگوں سے میری واقفیت ہے، وہ سب لوگ رطب اللسان ہیں کہ آپ کو ان سے کس قدر محبت ہے، خود میرا دل بھی اسی احساس سے لبریز ہے، میری زندگی کے اہم فیصلے آپ کی پر محبت وخلوص رائے کا نتیجہ ہیں، اس وقت آپ کی محبت کے کئی نمونے ذہن میں تازہ ہو رہے ہیں، ایک واقعہ تحریر کرتا ہوں:

زمانہ طالب علمی میں جب کہ مجھ سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے، ایک بار اعتکاف کے لئے رائے بریلی حاضری ہوئی، آپ نے مجھے قریب بلایا اور مجھ سے میرے نتیجہ امتحان کے متعلق سوال کیا، میں نے عرض کیا کہ سنا ہے کہ امتحان میں کامیابی ملی ہے، فرمایا کہ یہ نہیں پوچھ رہا ہوں، اس کا تو مجھے یقین ہی ہے، میرا مطلب ہے کہ تمہاری پوزیشن کیا ہے؟ پھر مجھ سے دیر تک مشفقانہ گفتگو فرماتے رہے، عالمی شہرت یافتہ اور ندوہ کے انتظام وانصرام میں نمایاں کسی شخصیت کی جانب سے محبت اور مشفقانہ توجہ کا یہ سلوک مجھ جیسے دیہاتی اور ادنی طالب علم کے لئے معراج سے کم نہیں تھا: ؏

گوشہ کلاہ دہقاں بآفتاب رسید

اس محبت کے مظاہر اس قدر ہیں کہ ان کا شمار ناممکن ہے، ندوہ کے ایام تدریس میں، پھر آکسفورڈ میں، یہاں تشریف لاتے تو مجھ سے دیر تک گفتگو فرماتے، میری رہائش پر بھی تشریف لاتے، مجھے اپنے قریب بٹھاتے، سمرقند میں امام بخاریؒ کے متعلق کانفرنس کے موقع پر سمرقند سے بخارا کا طویل سفر کرتے ہوئے بس میں مجھے اپنے پاس بٹھایا، اور راستہ بھر مختلف موضوعات پر مشفقانہ گفتگو فرماتے رہے۔

صحبت کی تاثیر:

آپ کی صحبت کی تاثیر سے کون انکار کرسکتا ہے، اس کی وجہ آپ کی پاکیزہ علمی زندگی اور آپ کے اخلاق کریمانہ ہیں، آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو لوگوں سے کہیں کہ جو میں کہوں وہ کرو، بلکہ آپ ان نفوس قدسیہ میں سے ہیں جو زبان حال سے گویا ہیں کہ وہ کرو جو میں کروں، اس صحبت مسیحا اثر کے لئے نظر پریشان اور دل بے چین ہے: ؎

اک تیری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

اس دنیا میں جو باقی ہے اس میں میرے لئے کشش نہیں، نہ دل کے سکون کا سامان، آج اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی لکھنؤ اور رائے بریلی کی یادیں دل میں پیوست ہیں اور ان صحبتوں اور مجلسوں کا ذکر ایک تڑپ پیدا کردیتا ہے: ؎

گفت معشوقے بعاشق کاف تے
تو بغربت دیدہ بس شہرہا
پس کدامی ازانہا خوشتراست
گفت آن شہرے کہ دروے دلبراست

یہ وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے آپ کو انسانی دلوں کا بادشاہ بنادیا ہے، اس حکمران عقل ودماغ اور شہنشاہ قلب ونظر کی پونجی زہد ہے، اس کا متاع فقر ہے، علم اس کا فخر، ادب اس کا امتیاز، عبودیت اس کی شان، خدا پر توکل واعتماد اس کا جوہر، مخلوقات سے بے نیازی اس کا خاص وصف، اس کا حسن ذاتی عہدوں اور منصبوں کے زیور سے مستغنی اور سیم وزر کے بار سے آزاد ہے: ؎

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے

Files\A027.TIF not found.

انجام کار

دوسری وآخری قسط

مجھ پر موت کے بعد کیا بیتی؟

ایک پراثر کھانی

پیشکش: محمد عبداللہ، سعودی عرب

میں نے تمنا کی کہ کاش میرے ابو میری آواز سن لیں اور میں انہیں بتادوں، ابو میرے قرضوں کی ادائیگی کردیں اور میری طرف سے صدقے کردیں، اللہ کے واسطے میرے لئے دعا کریں، لیکن کون ہے جو انہیں بتادے، میں نے محسوس کیا کہ بعض اوقات میرے جسم کی گرمی کم ہوجاتی تھی لیکن اچانک پھر سے بڑھ جاتی تھی، میں نے اندازہ لگایا کہ اسکا تعلق میرے حق میں لوگوں کی دعائیں ہیں، اچانک میری قبر میں پھر وہی روشنی آئی، جو اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا، یعنی سورۃ الملک کی، سورۃ الملک نے کہا تمہارے لئے دو خوشخبریاں ہیں: میں نے اشتیاق کے ساتھ فوراً کہا: ''کیا ہیں؟''۔

تمہارے دوست نے اللہ کی خاطر تمہارا قرضہ معاف کردیا ہے، میں نے اللہ تعالی کا شکر ادا کیا، اور مجھے پتہ تھا کہ میری گرمی کم ہوجانے کی وجہ سے شاید یہی تھی، میں نے کہا دوسری بشارت کیا ہے؟، اس نے کہا میں نے اللہ سے بہت درخواستیں کیں لیکن انسانوں کے حقوق وہ معاف نہیں کرتا، البتہ اللہ نے ایک فرشتہ بھیج دیا ہے جو تیرے رشتہ داروں میں سے کسی کو خواب میں آئے گا، تاکہ وہ تمہارے قرضوں کے متعلق سمجھ جائیں۔

پھر اس نے پوچھا: ''تمہارے خیال میں کون بہتر ہے، جس کو خواب میں فرشتہ کسی شکل میں آئے اور پھر وہ اس کو سچا سمجھ کر قرضہ کی ادائیگی کرے، میں نے اپنی امی کے بارے میں سوچا؛ لیکن پھر سوچا کہ اگر اس نے مجھے خواب میں دیکھا تو رونا شروع کردے گی، اور خواب کی تعبیر نہیں سمجھ سکے گی، پھر میں نے تمام رشتہ داروں کے متعلق سوچا اور جو بندہ مجھے بہتر لگا، وہ میری بیوی تھی، کیونکہ وہ ہمیشہ خوابوں کا اہتمام کرتی تھی، میں نے کہا میری بیوی اگر مجھے خواب میں دیکھ لے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی تعبیر سمجھ جائے''، سورۃ الملک نے کہا: ''میں متعلقہ فرشتے کو اطلاع دیتی ہوں اور اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ آپ کی مشکل کو آسان کردے''۔

اس کے بعد سورۃ الملک چلی گئی اور میری قبر میں بدستور وہ روشنی باقی تھی، جو میرے والد کی دعا کی برکت سے آئی تھی، اور میں انتظار کرتا رہا، جیسے کہ جیل کے اندر ہوں، مجھے ٹائم کا کوئی اندازہ نہیں تھا، کیونکہ یہاں گھڑی نہیں تھی، نا نماز، نا کھانا پینا، نا اور کوئی مصروفیات، دعائیں مانگنا اور ذکرواذکار بھی بے کار، بعض اوقات لوگوں کے قدموں کی آوازیں سن لیتا، تو اندازہ کرلیتا کہ شاید کسی کا جنازہ ہے، بعض اوقات لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں آجاتی تھیں، تو مجھے تعجب ہوتا تھا کہ ان کو اندازہ نہیں ہے کہ ہم کس صورت حال سے دوچار ہیں''۔

کافی وقت گزرنے کے بعد اچانک میرے جسم کی گرمی بڑھنی شروع ہوئی، اور میں چیخنے لگا، ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک تندور کے اندر ہوں، میرے خوف میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا؛ لیکن پھر اچانک گرمی کم ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ بالکل غائب ہوگئی، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیوں ہوجاتا ہے، اسکے بعد ایک بار پھر سورۃ الملک کی روشنی آگئی، اور مجھے کہا تمہیں مبارک ہو، میں نے کہا وہ کیسے؟، اس نے کہا خوابوں کا فرشتہ تمہاری بیوی کو خواب میں گیا اور تمہاری بیوی نے خواب میں تمہیں ایک سیڑھی پر چڑھتے دیکھا اور دیکھا کہ سات سیڑھیاں باقی ہیں، اور تم

پریشان کھڑے ہو کیونکہ آگے نہیں چڑھ سکتے، پھر وہ فجر کی نماز سے پہلے اٹھی، تمہاری یاد میں روئی، اور صبح ہوتے ہی ایک عورت سے رابطہ کیا جو خوابوں کی تعبیر بیان کرتی ہے اور اسے اپنا خواب سنایا، اس عورت نے کہا اے بیٹی! تمہارے شوہر قبر میں تکلیف میں مبتلا ہے، کیونکہ اس پر کسی کا سترہ سو ریال قرض ہے، تیری بیوی نے پوچھا کس کا قرض ہے، اور ہم کیسے ادا کریں؟، اس نے کہا مجھے نہیں معلوم اس بارے میں علماء سے معلوم کرو، پھر تیری بیوی نے ایک شیخ کی اہلیہ سے رابطہ کیا اور اسے ساری بات بتادی، تاکہ وہ شیخ سے جواب پوچھ لے، الغرض شیخ نے کہا کہ میت کی طرف سے صدقہ کردے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالی اسے قبول کرکے میت کا عذاب ہٹا دے، تیری بیوی کے پاس سونا تھا جس کی قیمت چار ہزار ریال تھی، اس نے وہ سونا تیرے والد کو دیا اور تیرے والد نے اس کے ساتھ مزید رقم ملا کر صدقہ کردیا، اور یوں تیرا مسئلہ حل ہوگیا، میں نے کہا الحمدللہ! مجھے اس وقت کوئی تکلیف نہیں ہے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالی کے فضل اور تیرے تعاون سے ہوا۔

سورۃ الملک نے کہا: ''اب اعمال والے فرشتے تمہارے پاس آجائیں گے'' میں نے پوچھا: ''کیا اس کے بعد بھی میرے لئے کوئی خطرہ ہے؟'' اس نے کہا سفر بہت لمبا ہے، ہوسکتا ہے اس میں کئی سال لگ جائیں، لہٰذا اس کے لئے تیار رہو۔

کئی سال والے جواب نے میری پریشانی میں اضافہ کردیا، سورۃ الملک نے کہا بہت سارے لوگ صرف اس وجہ سے قبروں میں عذاب جھیل رہے ہیں کہ وہ بعض باتوں کو معمولی سمجھتے تھے، جبکہ اللہ کے نزدیک وہ معمولی نہیں ہیں، میں نے کہا مثلاً کون سے اعمال؟

اس نے کہا: ''بہت سارے لوگوں پر قبروں میں اس لئے عذاب ہے کہ وہ پیشاب سے نہیں بچتے تھے، اور گندگی کی حالت میں اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے تھے'' اس طرح چغلی، چوری، سود اور مال یتیم کی وجہ سے بہت سارے لوگوں پر عذاب ہو رہا ہے، پھر اس نے کہا کہ کچھ لوگوں پر عذاب قبر اس لئے ہے تاکہ قیامت آنے سے پہلے ان کا کھاتہ صاف ہوجائے، اور کچھ لوگوں پر قیامت تک عذاب رہے گا، اور پھر جہنم میں داخل کئے جائیں گے، میں نے کہا اللہ تعالی کی سزا سے بچنے کی کوئی سبیل ہے؟ سورۃ الملک نے کہا کہ عمل تو تمہارا منقطع ہوچکا ہے، البتہ تین کام ایسے ہیں جو تمہیں اب بھی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

میں نے پوچھا وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا: ''اہل وعیال کی دعا اور نیک عمل، اس کے علاوہ کوئی کام اگر تم نے دنیا میں کیا ہے، جو انسانوں کے لئے نفع بخش ہو، مثلاً مسجد کی تعمیر، تو اس سے تم مرنے کے بعد بھی مستفید ہوگا، اس طرح اگر علم کی نشر واشاعت میں تم نے حصہ لیا ہو، تو وہ اب بھی تمہارے لئے نفع بخش ہے۔

میں نے کہا میں کتنا بدبخت ہوں کہ دنیا میں کتنے عمل کے مواقع تھے، جس سے میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، اور آج بے یار و مددگار قبر میں پڑا ہوں، میرا دل چاہا میں چیخ چیخ کر لوگوں کو پکاروں کہ اے لوگو! قبر کے لئے تیاری کرلو، خدا کی قسم اگر تم لوگوں نے وہ کچھ دیکھا جو میں نے دیکھا، تو مسجدوں سے باہر نہیں نکلو گے اور اللہ کی راہ میں سارا مال لگا دو گے، سورۃ الملک نے کہا: مردہ لوگوں کی نیکیاں عام طور پر شروع کے دنوں میں بہت ہوتی ہیں لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ کم ہوتی چلی جاتی ہیں، میں نے پوچھا کیا یہ ممکن ہے کہ میرے گھر والے اور میرے رشتہ دار مجھے بھول جائیں گے، مجھے یقین نہیں آرہا ہے، کہ وہ اتنی جلدی مجھے بھول جائیں گے، اس نے کہا نہیں ضرور ایسا ہوگا بلکہ تم دیکھو گے کہ شروع میں تمہاری قبر پر تمہارے اہل وعیال زیادہ آئیں گے، لیکن جب دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوں گے، تو تمہاری قبر پر آنے والا ایک بندہ بھی نہیں ہوگا، مجھے یاد آیا کہ جب ہمارے دادا کا انتقال ہوا تھا، تو ہم ہر ہفتے ان کی قبر پر جایا کرتے تھے، پھر ہر مہینے میں ایک بار اور پھر ہم انہیں بھول گئے، جب میں زندہ تھا، تو مردوں کو بھول جاتا تھا؛ لیکن آج میں خود اس حالت کو پہنچ چکا ہوں، دن ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں، اور میری مدد کے لئے کوئی نہ آتا، سوائے چند اعمال کے جو مجھے پہنچتے تھے، یا میرے والد،

بھائیوں اور دوسرے رشتے داروں کا میری قبر پر آنا، جو رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا، زیادہ تر مجھے اپنی والدہ کی دعا پہنچتی رہی، جو وہ تہجد میں میرے لئے کرتی رہی، بخدا وہ دعا میرے لئے طمانیت کا باعث ہوتی تھی، نیک اعمال کا آنا کم ہوتا چلا گیا، نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سورۃ الملک کا آنا بھی بند ہوگیا، میری قبر میں پھر اندھیرا چھا گیا، مجھے بعض گناہ یاد آئے جو میں نے کئے تھے، ایک ایک دن اور ایک ایک گھڑی یاد آ رہی تھی، مجھے اپنے گناہ پہاڑ کے برابر لگ رہے تھے، اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا، کتنے گناہ ہیں جو میں نے بڑی دلیری سے کئے تھے، کتنی نمازیں ہیں جو میری فوت ہوگئی ہیں، کتنی فجر کی نمازیں ہیں جو میں نے غفلت کی وجہ سے نہیں پڑھی ہیں، یہ سارے گناہ یاد کر کے میں اتنا رویا کہ مجھے ٹائم کا چونکہ اندازہ نہیں تھا، اس لئے اگر میں کہوں کہ مہینوں رویا ہوں گا تو مبالغہ نہیں ہوگا، ایک دن اچانک ایسی روشنی آئی جیسے سورج نکل چکا ہو اور میں نے فرشتوں کی آوازیں سنیں کہ وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو چکا ہے، کہ میرے پاس سورۃ الملک آئی اور خوشخبری سنادی، سورۃ الملک نے بتلایا کہ رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوگیا ہے، اور یہ رحمت اور معافی کا مہینہ ہے، اور اس میں بہت سارے مردے مسلمانوں کی دعاؤں کی برکت سے نجات پالیتے ہیں، میں بہت خوش ہوا، اللہ تعالی انسانوں پر کتنا مہربان ہے، لیکن انسان ہے کہ گمراہی پر تلا ہوا ہے۔

سورۃ الملک نے بتایا کہ اللہ تعالی کسی کو آگ میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن یہ انسانوں کی اپنی حماقت ہوتی ہے کہ وہ ایسے گناہ کر جاتے ہیں، جو اس کی سزا کا موجب ہوتے ہیں، پھر اس نے کہا کہ اب تھوڑی دیر بعد مسلمان نماز پڑھیں گے اور تم ان کی آوازیں سنو گے، سورۃ الملک چلی گئی اور میری قبر میں بدستور روشنی تھی، اور میں نے پہلی بار مسجد سے آنے والی آوازیں سن لی، اپنی زندگی کو یاد کیا اور تراویح کو یاد کیا تو بہت رویا، میں نے سنا کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں اور پھر میں نے امام کی دعا سن لی کہ وہ پڑھ رہا تھا:

"اللّٰھم لاتدع لنا فی مقامنا ھذا ذنباً اِلَّا غفرته ولا ھماً اِلَّا فرجته ولا کرباً اِلَّا نفسه ولا مریضاً اِلَّا شفیته ولا مبتلی اِلَّا عافیةً ولا میتاً اِلَّا رحمةً، برحمتك یا ارحم الراحمین"۔

اس دعا سے مجھے بہت سکون ملا، اور میں نے تمنا کی کہ امام دعا کو طول دیدے، اور میں نے محسوس کیا کہ وہ دعا سیدھی قبول ہو رہی ہے، کیونکہ مجھے اس سے کافی خوشی اور راحت مل رہی تھی، میں روتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ آمین پڑھتا جا رہا تھا، اس طرح رمضان کا سارا مہینہ بہت سکون اور راحت سے گزرا۔

اور پھر ایک دن میری قبر میں انسان کی شکل میں ایک آدمی آیا، جس سے بہت تیز خوشبو آ رہی تھی، میں حیران ہوا کیونکہ مرنے کے بعد یہ پہلا انسان تھا جو میں دیکھ رہا تھا، اس نے مجھے سلام کیا اور جواب میں وعلیکم السلام کہا، اس نے کہا میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ اللہ تعالی نے تمہارے گناہ معاف کئے ہیں۔

میں نے کہا کہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ کون ہیں؟ میں پہلی دفعہ قبر میں انسان کی شکل دیکھ رہا ہوں، اس نے کہا میں انسان نہیں ہوں، میں نے پوچھا تو کیا آپ فرشتے ہیں؟ بولا نہیں میں دراصل تمہارا نیک عمل ہوں، تمہاری نمازیں، تمہارے روزے، حج اور انفاق فی سبیل اللہ اور صلہ رحمی وغیرہ کو اللہ تعالی نے اس شکل میں تمہارے پاس بھیجا ہے، میں بہت خوش ہوا اور اللہ تعالی کا شکر ادا کیا، میں نے پوچھا تم اتنے لیٹ کیوں آئے؟

اس نے کہا تمہارے گناہ اور تمہارے قرضے میری راہ میں رکاوٹ تھے اور جب اللہ تعالی نے معافی کا اعلان کر دیا، تو میرے لئے راستہ کھل گیا، میں نے پوچھا تو کیا اس معافی کے بدلے میں اللہ تعالی مجھے جنت دے گا، اس نے کہا یہ بات اللہ تعالی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، پھر اس نے کہا قیامت کے دن میزان سے تمہاری جنت اور دوزخ جانے کا پتہ چلے گا، اس کے بعد عمل صالح نے کہا کہ تمہارے کچھ نیک اعمال بالکل زندگی کی آخری گھڑیوں میں کام آ گئے، میں نے پوچھا وہ کیا ہیں؟، اس نے کہا اگر تمہیں یاد ہو، تو مرتے وقت اللہ تعالی نے تمہیں

توفیق دی اور تم نے کلمہ تشہد پڑھا، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ فرشتوں کو کتنی خوشی ہوئی کہ تمہاری زندگی کا خاتمہ توحید پر ہوا، جب کہ شیطان تم کو نصرانیت اور یہودیت کی تلقین کر رہا تھا، اس وقت تمہارے ارد گرد دو قسم کے فرشتے موجود تھے، ایک وہ جو مسلمانوں کی روحیں قبض کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو کافروں کی روحیں قبض کرتے ہیں، جب تم نے کلمہ پڑھا، تو وہ فرشتے چلے گئے جو کافروں کی روحیں قبض کرتے ہیں اور پھر نیک فرشتوں نے تمہاری روح قبض کر لی۔

میں نے پوچھا اس کے علاوہ بھی کوئی نیکی ہے؟ اس نے کہا ہاں جب تم نے ڈرائیور کو سگریٹ چھوڑنے کی نصیحت کی، تو آج جو خوشبو تم سونگھ رہے ہو، اس نصیحت کی بدولت ہے، اس کے علاوہ اپنی والدہ کو تمہاری کال اور اسکے ساتھ جو بھی تم نے باتیں کیں، اللہ تعالی نے ہر بات کے بدلے تمہارے لئے نیکیاں لکھ دیں، مجھے یاد آیا جو باتیں میں نے والدہ سے کی تھیں، مجھے پتہ ہوتا تو میں ان باتوں میں گھنٹہ لگا دیتا۔

پھر عمل صالح نے بتایا کہ زندگی کے آخری وقت میں ایک گناہ بھی تمہارے کھاتے میں لکھا گیا، میں حیران ہوا اور پوچھا وہ کیسے؟ عمل صالح بولا، تم نے بچی سے کہا، میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا، اس طرح تم نے اس سے جھوٹ بول دیا، کاش مرنے سے پہلے تم توبہ کر لیتے، میں نے رویا اور کہا: ''اللہ کی قسم میرا ارادہ جھوٹ کا نہیں تھا، بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ اس طرح وہ میرے آنے تک صبر کر لیگی''۔

اس نے کہا: ''جو بھی ہو، آدمی کو سچ بولنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالی سچے لوگوں کو پسند کرتا ہے اور جھوٹ بولنے والوں کو ناپسند کرتا ہے، لیکن لوگ اس میں بہت تساہل اور غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں''۔

پھر اس نے کہا: ''تمہاری وہ بات بھی گناہ کے کھاتے میں لکھ دی گئی ہے، جو تم نے ائیرپورٹ میں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہہ دی، کہ اللہ تمہارا حساب کر دے''، اس طرح تم نے ایک مسلمان کا دل دکھایا، میں حیران ہو گیا کہ اتنی اتنی معمولی باتیں بھی ثواب اور گناہ کا باعث بنی ہیں۔

عمل صالح نے مزید بتایا کہ یہ انسانوں پر اللہ تعالی کا بہت بڑا احسان ہے کہ جب وہ ایک نیکی کریں تو اللہ تعالی اسے ۱۰/ گناہ بلکہ ۷۰۰/ گناہ بڑھا دیتا ہے اور بہترین اعمال وہ ہیں جو اللہ تعالی کو زیادہ محبوب ہیں۔

میں نے کہا پنج وقتہ نماز کے بارے میں کیا خیال ہے؟ عمل صالح نے کہا کہ نماز، زکوۃ، صیام اور حج وغیرہ تو فرائض ہیں، میں ان کے علاوہ بھی تمہیں ایسے اعمال بتادوں گا، جو اللہ تعالی کو بہت محبوب ہیں، میں نے کہا وہ کیا ہیں؟ بولا تمہیں عمر جب ۲۰/ سال تھی، تم عمرے کے لئے رمضان کے مہینے میں گئے تھے، تم نے وہاں سوریال کی افطاری خرید کر لوگوں میں بانٹ دی، اس کا بہت اجر تم نے کمایا ہے۔

اس طرح ایک بار بوڑھی عورت کو کھانا کھلایا تھا، وہ بوڑھی ایک نیک عورت تھی، اس نے تمہیں جو دعائیں دی اس کے بدلے اللہ تعالی نے تمہیں بہت نیکیاں اور اجر دیا ہے، میں تمہیں ایک اور بات بتادوں، ایک بار تم مدینہ جار ہے تھے کہ راستے میں تمہیں ایک آدمی کھڑا ملا، جس کی گاڑی خراب ہوئی تھی، تم نے اس کی جو مدد کی، اللہ تعالی کو تمہاری وہ نیکی بہت پسند آئی اور تمہیں اس کا بہت بڑا اجر ملا ہے۔

اسکے بعد میری قبر کھل گئی اور اس میں بہت زیادہ روشنی آ گئی، فرشتوں کے گروہ در گروہ آتے ہوئے نظر آئے اور عمل صالح بھی۔

ذرا سوچئے! یہ کہانی عبرت کے لئے لکھی گئی ہے؛ لیکن احادیث مبارکہ کے بیان کے مطابق ہے۔

کیا اس کہانی کے سننے کے بعد بھی ہم آخرت کے لئے فکر مند نہیں ہوں گے؟

کیا اس کہانی کے بعد بھی ہم گناہ کریں گے؟

کیا اس کہانی سننے کے بعد بھی ہم فجر کی نماز سے غفلت نہیں برتیں گے؟۔

اللہ سبحانہ تعالی ہم سب کو نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ اور اسکے دین کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے۔

نقوش حیات

یادگارِ اسلاف

حضرت حکیم مفتی احمد حسن خان صاحب ٹونکیؒ

مولانا نواب عالم ندوی مہتمم جامعہ معین الدین چشتی، اجمیر

۲۵/نومبر ۲۰۱۶ء مطابق ۲۴/صفر ۱۴۳۸ھ بروز جمعہ، پونے دس بجے صبح، راجستھان کے معروف عالم دین اور مشہور طبیب حضرت مولانا مفتی احمد حسن خان صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ جے پور میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ہجری کلینڈر کے مطابق آپ کی عمر ۱۱۰/سال، اور عیسوی کلینڈر کے مطابق ۱۰۷/سال تھی۔

آپ کی طویل عمر کے متعلق حضرت مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑا دلچسپ نکتہ بیان فرمایا ہے، لکھتے ہیں: ''مؤرخ اسلام اور رجال کے زبردست ماہر حضرت امام ذہبیؒ نے ان رواۃ حدیث کے تذکرہ پر ایک رسالہ لکھا ہے جن کی عمر سو سے متجاوز ہے، جن میں آخری شخصیت صحیح بخاری کے اہم راوی ابوالعباس احمد بن ابی طالب الحجار کی ہے، حجار نے ابوعبداللہ الحسین بن المبارک الزبیدی سے ۶۳۰ھ میں پوری بخاری شریف کا سماع کیا، اور آخری بار علماء اور طلباء نے حجار سے پوری بخاری شریف ۷۳۰ھ میں پڑھی، اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب ہمارے زمانہ کے حجار ہیں''۔ (فتاوی علم وحکمت جلد۲ صفحہ ۴۵)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سلف کی یادگار تھے، آپ قابل رشک، ہر دلعزیز، اور گوناگوں خصوصیات کی حامل شخصیت کے مالک تھے، آپ ایک حاذق طبیب، ماہر فقیہ، عالی سند محدث اور دردمند مصلح تھے، اچھے خوش نویس ہونے کے ساتھ ساتھ فلکیات سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، آپ اچھے جلد ساز بھی تھے، عربی، اردو، فارسی تینوں زبانوں میں مہارت کے ساتھ ساتھ ان میں شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے، آپ کا وطنی تعلق سرزمین علم وفن ریاست ٹونک راجستھان سے رہا، بعد میں گلابی نگری جے پور میں مقیم ہوگئے تھے، نسبی تعلق افغانستان سے تھا، آپ کے اجداد افغانستان سے ابتدا میں ریاست رام پور آئے تھے اور وہاں سے آپ کا خاندان ٹونک آکر بس گیا تھا، اسی وجہ سے آپ کی نسبت سید محمدی کمال زئی ہے، راجح قول کے مطابق آپ کی پیدائش جنوری ۱۹۱۰ء میں ٹونک میں ہوئی، آپ کے والد صاحب جناب منشی محمد عبدالمجید خان ٹونکی کا شمار ریاست کے عمائدین میں ہوتا تھا، آپ ریاست میں منشی کے عہدہ پر فائز تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مکمل تعلیم ٹونک (جو محمد آباد کے نام سے موسوم تھا) کے علمی ماحول میں ہوئی، ٹونک اس زمانہ میں اساطین علم وفن کا مرکز بنا ہوا تھا، تشنگان علم مختلف گوشوں سے وہاں حاضر ہوتے اور فیضیاب ہوکر جاتے تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنے اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ علامہ حیدر حسن خان صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ کے ضمن میں ریاست ٹونک کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''ٹونک اس وقت درس وتدریس کا ایک بڑا مرکز بنا ہوا تھا، راجپوتانہ (راجستھان) کے اس ریگستان میں وہی ایک سرسبز وشاداب علمی خطہ تھا، جہاں سرحد وافغانستان تک سے شمع علم کے پروانے ہجوم کرتے تھے، اس وقت وہاں دو مستقل مدرسے طلباء اور شائقین علم کا ملجا وماوی بنے ہوئے تھے، ایک مدرسہ خلیلیہ، دوسرا مدرسہ ناصریہ، پہلے کے سرپرست خود والی ریاست نواب ابراہیم علی خان مرحوم تھے، یہاں

حکیم برکات احمد صاحب مسند آرائے تدریس تھے، جو مولانا عبدالحق خیرآبادی کے مایہ ناز شاگرد اور ان کے علم کے وارث سمجھے جاتے تھے، اور جن کی علوم عقلیہ میں شہرت ہندوستان سے تجاوز کر کے افغانستان و یاغستان تک پہنچ چکی تھی، دوسرے مدرسہ ناصریہ کے سرپرست نواب صاحب کے بھائی صاحبزادے عبدالرحیم خان تھے، یہاں بھی کئی جید عالم مسند درس وافادہ آراستہ کئے ہوئے تھے، جن میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب ٹونکی مہاجر کابل خاص طور پر قابل ذکر ہیں''۔(پرانے چراغ ۱۸۶/ ۱۸۷جلد۱)

تعلیم و تربیت اور علمی لیاقت:

اس وقت ٹونک میں علوم اسلامیہ: تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، اصول حدیث واصول فقہ نیز علوم عربیہ: نحو، صرف، بلاغت وغیرہ، اور عربی، فارسی واردو زبان و ادب کی تعلیم کیساتھ ساتھ مروجہ صنعتی و معاشرتی علوم: تاریخ، جغرافیہ، منطق، فلسفہ، فلکیات ریاضی، طب، وعلم کیمیاء کے ماہرین مسند درس وافادہ سجائے ہوئے تھے، ان بزرگوں کے یہاں نظریاتی تعلیم پر کم اور تطبیقی وتجرباتی تعلیم پر اصل توجہ دی جاتی تھی۔

حضرت مفتی صاحب نے نہایت محنت اور لگن کے ساتھ مذکورہ بالا مروجہ علوم وفنون کی تعلیم ٹونک ہی میں حاصل کی، اس ماحول کی جھلک آپ کی شخصیت میں بھی صاف طور پر دکھائی دیتی تھی، کچھ وجوہات کی بنا پر حضرت مفتی صاحبؒ کی باضابطہ تعلیم کا آغاز شادی کے بعد ہوا، چنانچہ حفظ وتجوید بروایت حفص کی تکمیل مدرسہ فرقانیہ، ٹونک سے ۱۳۵۵ھ میں کی، اس وقت آپ کی عمر ۲۸/سال کے قریب تھی۔

اهم اساتذہ کرام:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہم اساتذہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ حفظ قرآن کریم وتکمیل روایت حفص (۱۳۵۵ھ میں): مولانا قاری محمد مصطفٰی مکی بن حافظ محمد صدیق ٹونکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے۔

☆ قرآت سبعہ وعشرہ ''من طریق الشاطبیۃ والدرۃ'' کی تکمیل (۱۳۶۱ھ میں): مولانا قاری حبیب اللہ بن غلام حیدر خان افغانی خیرجیلوی رحمۃ اللہ علیہ سے۔

حدیث شریف:

☆ مشکاۃ المصابیح: مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے۔

☆ مؤطا امام محمد: قاضی عرفان خان صاحب سے۔

☆ صحاح ستہ بشمول شمائل ترمذی: مولانا منتخب الحق صاحب سے۔

☆ دوسری مرتبہ صحاح ستہ بشمول مؤطا امام مالک وتفسیر بیضاوی وغیرہ: علامہ حیدر حسن خان صاحب ٹونکیؒ سے۔

عربی زبان وادب: مولانا یوسف خان صاحب افغانی اور مشہور سلفی عالم مولانا محمد بن یوسف سورتی صاحبؒ سے۔

طب وحکمت: ابتدائی کتب حکیم سید برکات احمد صاحب کے قدیم ترین شاگرد، مفتی حکیم خلیل الرحمٰن صاحب اور مولانا حکیم سید امیر حسن صاحب محدث دہلویؒ سے، مولانا قاضی محمد عرفان خان بن عبدالحلیم ٹونکی صاحب (ولادت: ۱۳۰۸ھ وفات: ۱۳۸۱ھ) سے ۶/ شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں سند طب حاصل کی اور پھر آپ ہی کی خدمت میں رہ کر ایک مدت تک تدریب طب کیا۔

عرفانی دواخانہ -طبی واصلاحی خدمات کا مرکز:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی خدمات کا آغاز تدریس سے کیا، ابتدائی زمانہ میں مدرسہ فرقانیہ، ٹونک میں اور گھر پر مختلف طلباء کو عربی وفارسی کی متعدد کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں ٹونک سے جے پور منتقلی کے بعد آپ نے اپنے محبوب استاذ مولانا قاضی حکیم عرفان خان صاحب ٹونکی کے نام پر، رام گنج بازار، جے پور میں عرفانی دواخانہ کے نام سے اپنے مطب کا آغاز کیا، آپ کا یہ مطب بڑا انرالا تھا، شاذ ونادر ہی ایسے مطب دیکھنے کو ملیں گے، جہاں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کے امراض کا ساتھ ساتھ علاج کیا جاتا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اخیر تک بڑی پابندی کے

ساتھ مطب تشریف لاتے تھے، مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا، جن میں بہت سے پیچیدہ امراض کے شکار مریض بھی ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر جن کی شفا لکھی تھی، جن میں عوام الناس سے لیکر علماء، صلحاء، دینی وسیاسی رہنماء، وزراء اور عمائدین، ملک بھر کے ہوتے تھے۔

یہی مطب آپ کا دارالافتاء بھی تھا، اور کبھی درسگاہ بھی بن جاتا تھا، شائقین علم آتے تھے اور آپ سے علمی استفادہ کرتے تھے، بے شمار افراد نے آپ سے حدیث، فقہ، تفسیر، تجوید وقرأت، طب کا درس لیا، بہت سے حکماء اور اطباء پیچیدہ امور میں آپ سے رجوع کرتے تھے، بعض شعراء اپنا کلام پیش کرکے اصلاح لیتے تھے، بہت سے لوگ خوش خطی کی مشق کرتے تھے، دینی امور سے ناواقف لوگوں کو یہاں سے دینی رہنمائی ملتی تھی، نادار اور غریب لوگوں کو تعاون ملتا تھا، ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو بڑی حکمت اور اعتدال کے ساتھ، شریعت کی روشنی میں جوڑا جاتا تھا، بکھرتے ہوئے خاندانوں کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی، مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو یہاں سے ہم آہنگی اور جزوی اختلافات سے صرف نظر کرکے اتحاد کے ساتھ رہنے کا پیغام ملتا تھا، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دور لوگوں کو خدا ورسول سے قریب کرکے سو فیصد طور پر دین سے وابستہ رہنے کی دردمندانہ تعلیم ملتی تھی، ''عرفانی دواخانہ'' کے اس متنوع الجہات پلیٹ فارم سے آپ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ گذشتہ اور موجودہ صدی کے تقریباً ۶۳؍سالوں پر محیط ہیں۔

عالی سند اور بلند پایہ محدث:

تذکرہ آچکا ہے کہ آپ کی سند حدیث بڑی عالی تھی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپ عظیم محدث علامہ حیدر حسن خان ٹونکی (ولادت: ۱۲۸۱ھ-۱۸۶۴ء وفات: ۱۳۶۱ھ-۱۹۴۲ء) شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء (جن کی سند صرف ایک واسطہ سے علامہ محمد بن علی شوکانی صاحب نیل الأوطار تک پہنچتی ہے) کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے، یہی وجہ تھی کہ ہند وبیرون ہند سے نہ صرف طلباء بلکہ علماء ومشائخ وقت بھی آپ سے اجازت حدیث کے لئے حاضر ہوتے تھے، اخیر کے سالوں میں علماء عرب کا بڑا رجوع ہوگیا تھا، چنانچہ دیگر ملکوں کے ساتھ ساتھ خاص طور پر خلیجی ممالک سے شائقین حدیث کے وفود آنے لگے تھے، جن میں عالم عربی کے چوٹی کے محدثین اور بعض بین الاقوامی پہچان رکھنے والے مشائخ بھی ہوا کرتے تھے، ان میں سے بہت سے لوگ ہفتوں قیام کرکے باضابطہ آپ کے سامنے مختلف کتب پڑھتے تھے، آپ مکمل چستی اور نشاط کے ساتھ بیٹھتے تھے، اس کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ فون پر بھی بالاستیعاب پوری صحاح ستہ وغیرہ کتب آپ کو سناتے تھے، اس کے لئے باضابطہ نظام الاوقات بنایا ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ متعینہ وقت پر بیٹھ جاتے، اسپیکر چالو کردیا جاتا تھا اور آپ نہایت اہتمام سے سنتے تھے، الغرض یہ ایک نہایت دلچسپ اور پرلطف داستان ہے۔

راقم کی پہلی حاضری حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں غالباً ۲۰۰۸ء میں بغرض علاج ہوئی تھی، اس کے بعد آنا جانا ہوتا رہا، اس دوران آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور آپ کی شخصیت سے واقفیت حاصل ہوتی گئی، لیکن شوال ۱۴۳۴ھ میں پہلی بار آپ کی مجلس درس میں سعودی عرب کے علماء ومشائخ کے ایک وفد کے ہمراہ شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی، ایک ہفتہ سے زائد اسباق ہوتے رہے، یہ ایک نورانی اور یادگار مجلس تھی، ان عرب علماء میں عالم عربی کے مشہور ومعروف محدث، استاذ محترم ڈاکٹر عبداللہ بن صالح بن محمد العبید حفظہ اللہ بھی شامل تھے، شیخ عبید صاحب اس وقت تک دنیا بھر کے تقریباً ایک ہزار سے زائد علماء ومشائخ سے استفادہ کرچکے تھے، اس کے بعد سے راقم کو بار بار حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اخیر دور کی غالباً سب سے بڑی اور یادگار مجلس درس حدیث وہ تھی جو جامعۃ الہدایہ جے پور میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ۲۴؍ویں اجلاس عام (مارچ ۲۰۱۵ء) کے

موقع پر جامعۃ الہدایہ کے احاطہ میں منعقد ہوئی تھی، اس مجلس میں ملک بھر سے علماء، دانشوران اور ملی رہنماء شریک تھے۔

آخری مجلس درس حدیث:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے آخری مجلس درس ۱۳،۱۴ر نومبر ۲۰۱۶ء کو ہوئی تھی، جس میں اسلامی دنیا کی مشہور شخصیت، سعودی عرب کے مایہ ناز عالم دین، ڈاکٹر عبداللہ بن صالح بن محمد العبید حفظہ اللہ شریک ہوئے تھے (جو اب سے قبل بھی دو مرتبہ آپ سے ہفتوں استفادہ کر چکے تھے) آپ کے ساتھ آپ کے رفیق سفر مولانا محمد افضل ندوی صاحب (دہلی) بھی شریک تھے، حسن اتفاق تھا کہ ۱۳ر نومبر ۲۰۱۶ء بعد عصر راقم سطور کو بھی، مولانا محمد عالم ندوی صاحب (بیاور) کے ساتھ شریک درس ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

فتاوی میں دعوتی حکمت:

فتاوی نویسی کی عظیم خدمت سے آپ ٹونک کے قیام کے زمانہ سے وابستہ ہو گئے تھے، ایک مدت تک ٹونک کے محکمہ شرعیہ (عدالت شرع شریف) میں مفتی کی حیثیت سے افتاء کی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۹۴۹ء میں کانگریسی اقتدار نے اس محکمہ شرعیہ کا خاتمہ کر دیا۔

واضح رہے کہ پورے غیر منقسم ہندوستان میں صرف ریاست ٹونک کا یہی محکمہ شرعیہ تھا جہاں علماء کی نگرانی میں معاملات فیصل ہوتے تھے، قتل وقصاص کے فیصلے بھی ایک زمانہ تک نافذ ہوتے رہے، بعد میں انگریزی اقتدار نے اس کو فوجداری عدالتوں میں منتقل کرا دیا، لیکن بعد تک ۵۴ر قسم کے مقدمات محکمہ شرعیہ ہی سے فیصل اور نافذ ہوتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں جے پور منتقلی کے بعد جے پور واطراف میں آپ کا تعارف ہوتا گیا، لوگ دینی مسائل میں آپ سے رجوع کرنے لگے، یہ سلسلہ تیز رفتاری کے ساتھ وسیع ہوتا گیا، اہلیان جے پور نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مفتی شہر کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا، اس کے لئے نہ کوئی کمیٹی بیٹھائی گئی اور نہ کوئی مجلس استقبالیہ سجائی گئی، بلکہ رفتہ رفتہ یہ لقب آپ کے لئے ''علم'' کے طور پر استعمال ہونے لگا، اس دوران ہزاروں کی تعداد میں استفتاء آئے اور آپ نے ان کے جوابات حکیمانہ انداز میں تحریر فرمائے، آپ کے فتاوی کا مجموعہ فتاوی علم وحکمت کے نام سے آپ کے شاگرد مولانا مفتی محمد ذاکر نعمانی جے پوری صاحب حفظہ اللہ نے مرتب کر کے ۳ر جلدوں میں شائع کرایا ہے، ان میں ۱۹۷۰ء کے بعد کے فتاوی شامل ہیں۔

فتوی نویسی کا انداز حکیمانہ اور مخلصانہ اور زبان بڑی صاف ستھری ہے، مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں: ''ہندوستان کے آخری فقیہ جن کے فتاوی میں نصح للامت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے، مسلمانوں کیلئے آسانی پیدا کرنے اور عام بندگان خدا کو ان کے مالک سے جوڑنے کے جذبے کے تحت اپنی محققانہ نظر کے ذریعہ آپ نے فتاوی کو دعوت و اصلاح کے شعبہ کا ایک حصہ بنا دیا، میں نے حکیم مفتی احمد حسن خان صاحب مدظلہ کے فتاوی پر نظر ڈالی تو اسی جذبہء دعوت واصلاح اور نصح لعامۃ المسلمین کا عکس یہاں نظر آیا''۔ (فتاوی علم وحکمت: ۲/۴۶)

حضرت مولانا مفتی کوکب عالم قاسمی صاحب مدظلہ العالی استاذ دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں: ''ان (مفتی احمد حسن خان صاحبؒ) کے فتاوی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، مفتی اعظم ہند کی سی تسہیل وتوسیع، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی مفتی اول دار العلوم دیوبند کی سی جامعیت واختصار اور فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کا سا اعتدال جھلکتا نظر آتا ہے''۔ (فتاوی علم وحکمت: ۱/۴۱)

حضرت مفتی محمد طاہر صاحب قاسمی مدظلہ العالی، مفتی مظاہر علوم سہارن پور لکھتے ہیں: ''محترم موصوف کے فتاوی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف حکم شرعی تحریر کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ بڑی دل سوزی کے ساتھ سائل کو اصلاح حال پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں''۔ (فتاوی علم وحکمت: ۲/۳۶)

خدمات پر اجمالی نظر:

☆ ٹونک میں محکمہ شرعیہ (عدالت شرع شریف) میں بحیثیت مفتی

وابستہ رہے، اور جے پور آنے کے بعد اس میں مزید توسیع ہوتی گئی، ۷۰؍سال سے متجاوز اس مدت میں ہزاروں فتاوی تحریر فرمائے، جن میں سے ایک معتد بہ حصہ ''فتاوی علم وحکمت'' کے نام سے، مولانا مفتی ذاکر صاحب نعمانی جے پوری حفظہ اللہ کی ترتیب سے ۳؍جلدوں میں شائع ہوگیا ہے۔

☆ آپ نے سفر نامہ حج بھی مرتب فرمایا تھا جو غیر مطبوع ہے۔

بعض طبی کتب پر عربی میں تعلیقات وحواشی بھی تحریر فرمائے ہیں۔

☆ "اشعار العرب في العلم الأخلاق والأدب" کے نام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ تحریر فرمایا تھا، جو طبع ہو چکا ہے۔

☆ ایک منظوم رسالہ: "ماذا يقول العبد المذنب الأحقر عند مجيئه روضة خير البشر" تحریر فرمایا تھا، یہ بھی غیر مطبوع ہے۔

☆ اپنے استاذ تجوید قاری حبیب اللہ خان افغانی صاحب کی نگرانی میں دوران طالب علمی میں ہی، علامہ ابراہیم جعبریؒ (م ۷۲۲ھ) کی شرح شاطبیہ کے قلمی نسخہ پر کام کیا۔

☆ برسوں، رمضان المبارک میں اردو ہندی اخبارات میں دینی مسائل سے متعلق آپ کی تحریر شائع ہوتی رہی۔

☆ ''قرآنی تقاضے'' کے نام سے آپ کا ایک رسالہ ہے، برسوں سے ''انجمن نوجوانان ملت'' جے پور کے زیر اہتمام ہندی میں شائع ہوتا آرہا ہے۔

☆ فلکیات سے آپ کو گہری واقفیت تھی، اس سلسلہ میں آپ کے دلچسپ واقعات بھی ہیں، آپ نے ایک دھوپ گھڑی بھی بنائی تھی، جو ایک عرصہ تک امام الدین کی مسجد ٹونک میں نصب تھی، بعد میں ضائع ہوگئی۔

☆ ہانڈی پورہ کی مسجد (محلّہ سلاوٹان، جے پور) میں ۱۴۳۱ھ تک ماہ رمضان میں ۳۵؍سال تک پابندی کے ساتھ درس قرآن دیتے رہے، جس کو مختلف لوگ ریکارڈ کرنے کا اہتمام کرتے تھے، ہر ترویحہ میں تلاوت شدہ آیات کا خلاصہ پیش فرماتے تھے۔

☆ ہر ماہ کے آخری اتوار کو آپ کا اصلاحی خطاب ہوتا تھا۔

☆ برسوں عیدین کے موقع پر، عیدگاہ جے پور میں آپ کا خطاب ہوتا تھا۔

☆ رؤیت ہلال کمیٹی جے پور کے رکن ہی نہیں بلکہ سرپرست تھے۔

☆ وقف بورڈ راجستھان کے بھی کچھ مدت تک ممبر رہے، پھر کچھ وجوہات کی بناء پر رکنیت ترک فرمادی۔

☆ طبیہ کالج جے پور کی کمیٹی کے ممبر اور اس میں ممتحن بھی رہے۔

تعلیمی نقطہ نظر:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع تعلیم کے قائل تھے، تعلیم میں ثنویت کو آپ امت مسلمہ کے لئے مناسب نہیں سمجھتے تھے، آپ نے اپنے دور کے جامع نصاب تعلیم کو بڑھا تھا، جس میں دینی علوم کے پہلو بہ پہلو معاشرتی علوم بھی شامل درس ہوتے تھے، مدارس کے ذمے داران اور تعلیم وتربیت سے وابستہ حضرات کو آپ اس سلسلہ میں تلقین فرمایا کرتے تھے، کسی نے آپ سے کہہ دیا کہ ریاضی کو مدرسہ میں پڑھانے سے کیا فائدہ؟ اس کا دین سے کوئی تعلق تھوڑا ہی ہے؟ اس پر آپ نے برملا پوچھا کہ ترکہ کے مسائل ریاضی سے واقفیت کے بغیر کیسے حل کروگے؟۔

اوصاف وکمالات:

حضرت مفتی احمد حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے متواضع، حلیم الطبع اور نظام الاوقات کے بڑے پابند تھے، علم بڑا متحضر تھا، حق گوئی کے سلسلہ میں بڑے جری تھے، بڑے خوددار تھے، کبھی کسی سے کوئی لالچ نہیں رکھتے تھے، بڑے بڑے صاحب ثروت اور باحیثیت لوگ آپ کے زیر علاج رہے، بڑے بڑے لوگوں نے آپ کے سامنے زانوتلمذ تہہ کیا، بڑی بڑی پیش کش کی گئیں، لیکن آپ کا ایک ہی اصول تھا، فرمایا کرتے تھے: ''ہمارا تعلق ان سے صرف مریض کا ہے، اگر اللہ نے ان کو شفا دے دی تو ہمارے لئے یہی سب سے بڑا انعام ہے'' (کوئی دوسری منفعت مطلوب نہیں)۔

ہر وقت کے لئے ایک کام اور ہر کام کے لئے ایک وقت آپ کی زندگی کا واقعہ بنا ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے طویل عرصہ تک عقیدت ومحبت کے روابط رکھنے والے اور آپ کے حالات ومعمولات کو قریب سے دیکھنے والے، حضرت مولانا مفتی محمد فاروق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ومجاز حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) کی زبانی آپ کی مشغولیات پر ایک نظر ڈالتے چلئے، لکھتے ہیں: ''ایک طرف مریضوں کا معاینہ، امراض کی تشخیص، ادویہ کی تجویز اور پھر دولت کدہ پر ادویہ سازی کی براہ راست نگرانی، دوسری طرف دیکھیں تو بالمشافہ شرعی مسائل وفتاوی کے مستفسرین کی کثرت اور تحریری سوالات واستفتاءات کے جوابات لکھنا، پھر ذاتی انفرادی اشغال واوراد نیز ان تمام امور ومصروفیات کے باوجود تن تنہا نقول فتاوی کا اہتمام کرنا قابل رشک وموجب غبطہ ہے''۔ (فتاوی علم وحکمت: ۲/۳۸)

اساتذہ اور ان کے متعلقین کا بڑا لحاظ فرمایا کرتے تھے، اساتذہ سے والد کا سا برتاؤ کرتے تھے، اور شاگردوں پر اولاد کی طرح شفقت فرمایا کرتے تھے، آپ کے خوش خطی کے اہم شاگردوں میں ہندوستان کے مشہور کاتب خلیق ٹونکی صاحب مرحوم تھے، اکثر بیمار رہا کرتے تھے، دہلی میں مقیم تھے، آپ نے از راہ شفقت ان کو پابند کیا تھا کہ سال میں کچھ وقت ہمارے پاس رہ کر علاج لیا کریں، چنانچہ خلیق صاحب جے پور آیا کرتے تھے اور آپ کے یہاں ہفتوں قیام کرتے تھے، یہ ایک مثال ہے، اساتذہ اور ان کے وابستگان تک کا آخری درجہ میں لحاظ اور احترام کرنے سے متعلق آپ کے ایسے واقعات بھی ہیں، جن کی مثالیں اسلاف کے تذکروں میں پڑھنے کو ملتی ہیں، اور آج کے اس ترقی یافتہ اور بے تکلفی کے دور میں جن کا تذکرہ بھی شاید بہت سے لوگوں کے نزدیک دقیانوسیت اور شخصیت پرستی کی بدترین علامت سمجھا جائے۔

بلاشبہ صحت ایک عظیم نعمت الٰہی ہے، اس کے متعلق حساب وکتاب بھی ہونا ہے، حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام نے حفظان صحت کا خوب اہتمام فرمایا ہے، اور امت کے لئے بڑے رہنما اصول آپ صلی اللہ علیہ وسلم عطاء فرما گئے ہیں، حضرت مفتی احمد حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے، دوسرے لوگوں کے علاج کے ساتھ ساتھ خود بھی زندگی بھر حفظان صحت کا اہتمام فرمایا، چنانچہ آپ کی عمر ۱۰۰/سال سے متجاوز ہونے کے باوجود کبھی چشمہ نہیں لگایا، اخیر کے تین چار سالوں کو چھوڑ کر آپ کی جملہ مصروفیات نشاط کے ساتھ جاری رہیں، درس کی آخری مجلس ۱۴/نومبر ۲۰۱۶ء یعنی وفات سے صرف ۱۱/روز قبل منعقد ہوئی تھی، ۱۳/نومبر کو راقم بعد عصر کی مجلس میں شریک تھا، حضرت مفتی صاحب صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے، گوکہ کمزوری اور تکان ہوتی تھی، بسا اوقات آپ کو لیٹ کر سننے کا مشورہ بھی دیا جاتا تھا؛ لیکن شاید غایت ادب میں آپ نے کبھی یہ بات گوارہ نہ فرمائی کی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے والے آپ کے سامنے بیٹھے ہوں اور آپ لیٹے ہوئے ہوں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے چار نمایاں اوصاف:

آپ کی زندگی کے چار پہلو بڑے اہم اور قابل اتباع ہیں:

(۱) تمام کاموں میں اخلاص وللّٰہیت، شہرت وناموری، اسباب دنیا اور اس کے ہنگاموں سے دوری، راقم گواہ ہے، بہت سے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ خلیجی ممالک کا دورہ فرمالیں اور ہم وہاں پر آپ کے لئے مکمل سہولیات کے ساتھ انتظام کریں گے، آپ کے دروس ہوں گے، آپ کی شخصیت متعارف ہو جائے گی کیونکہ اس دور میں آپ کی طرح عالی سند کے محدثین بمشکل ہی ملیں گے؛ لیکن آپ کبھی بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

(۲) ابتداء ہی سے علم کے بڑے شوقین اور قدرداں تھے، نادر اور نئی کتابیں کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش فرماتے تھے، اس سلسلے میں ملک بھر میں متعدد اسفار بھی دور دراز کے کئے ''الحکمۃ ضالۃ المؤمن'' پر آپ کا عمل رہا، حصول علم میں عار اور حجاب محسوس نہیں فرماتے تھے، مسائل کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، آپ کے خوش خطی کے شاگرد خلیق ٹونکی صاحب تھے، وہ آپ سے اصلاح لیتے تھے اور آپ ان کے والد صاحب سے جلد سازی سیکھتے تھے۔

(۳) نرم خوئی اور رقت قلبی آپ کا اہم وصف تھی، سختی کا معاملہ نہیں فرماتے تھے، بلکہ عفو درگذر آپ کی زندگی کی پہچان بنا رہا، اس کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

(۴) مکاتب فکر، مسالک یا ذاتی منفعت کی بنیاد پر مسلمانوں کے درمیان منافرت سے آپ کو تکلیف ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے بزرگوں کی اصطلاح میں، آپ زندگی بھر ''رفع نزاع باہمی'' کے لئے تگ ودو کرتے رہے، اپنی تقریر وتحریر اور انفرادی گفتگو میں اس کی جانب متوجہ فرماتے، آپ کے فتاوی سے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

ایک استفتاء آیا کہ ہمارے یہاں مسجد میں ایک صاحب ایک ایسی کتاب سے تفسیر قرآن بیان کرتے ہیں جس میں مختلف فیہ اور جارحانہ اسلوب اپنایا گیا ہے، اس تفسیر کو پڑھنا کیسا ہے؟

جواب لکھتے ہیں: ''لوگوں کو دین کی طرف حسن خلق اور دینی حکمت سے بلانا چاہئے، انہیں اختلاف ونفرت میں ڈالنا دانشمندی کی بات نہیں، اسلئے اس مسجد میں مذکورہ تفسیر نہ پڑھیں، یا پھر ایسی عبارتیں آئیں تو انھیں چھوڑ دیں، اور وہ عبارات اور امور سامنے لائیں جن سے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور انقیاد واطاعت کا جذبہ بڑھے''۔ (فتاوی علم وحکمت: ۱/۱۶۰)

اولاد:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بیٹی اور پانچ بیٹے ہیں۔

(۱) **محترمہ زیب النساء:** اہلیہ سعادت حسین صاحب مرحوم، ٹونک سب سے بڑی ہیں، اس وقت ٹونک میں ہیں، قرآن کریم کی حافظہ ہیں، طب کی اچھی واقف کار ہیں۔

(۲) **حکیم حبیب حسن خان مرحوم** (۱۹۴۰-۲۰۱۳ء):

اعلی اخلاق کے حامل اور ولی صفت انسان تھے، بہترین حافظ قرآن اور ماہر حکیم تھے، عربی وفارسی کا اعلی ذوق رکھتے تھے۔

(۳) **عزیز حسن خان صاحب** (ایل۔ایل۔ایم)

سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں، حافظ قرآن اور عربی فارسی کے واقف کار ہیں، خوش مزاج اور با اخلاق ہیں۔

(۴) **سعید حسن خان صاحب** (ایم۔ایس۔سی)

نہایت خلیق، متواضع، ملنسار اور خدمت گذار ہیں، سیفیہ کالج بھوپال سے ایم۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی، قرآن شریف اور عربی وفارسی کے واقف کار ہیں، راجستھان حکومت میں فوڈ انسپکٹر رہے، ۲۰۱۳ء میں سبکدوش ہوئے۔

(۵) **حکیم زاہد حسن خان صاحب ایڈوکیٹ:**

نہایت خلیق، خوددار، متواضع، دوراندیش اور ملنسار ہیں، ایڈووکیٹ بھی ہیں، راجپوتانہ طبیہ کالج جے پور سے ۱۹۷۵ء میں عمدۃ الحکماء کی ڈگری حاصل کی، قرآن شریف اور عربی وفارسی کے واقف کار ہیں، ماہر طبیب ہیں، ۱۹۷۵ء سے حضرت مفتی صاحبؒ کے شریک کار رہے، اور اس وقت مطب میں آپ کے جانشین ہیں۔

(۶) **ڈاکٹر ذاکر حسن خاں صاحب:**

ایم۔بی۔بی۔ایس ہیں، قرآن شریف اور عربی وفارسی کے واقف کار ہیں، گنگا پول ہاسپٹل، گنگا پول جے پور کے ڈائرکٹر ہیں۔

□□□□□□

خط ایڈیٹر کے نام:

محترمی ومکرمی گرامی قدر جناب ایڈیٹر صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعا ہے کہ میرے برادر نسبتی حافظ امتیاز احمد ندوی علیہ الرحمہ انتقال کر گئے، انہوں نے سمریاواں بازار ضلع سنت کبیر نگر میں جامعہ امامہ للبنات الاسلامیۃ کے نام سے ادارہ قائم کیا، اور بہت سے رفاہی کام کئے، جواں سالم میں ان کی رحلت دعوت وتبلیغ کی راہ میں ہوئی۔

ایک مضمون آپ کی خدمت میں ارسال ہے، امید ہے کہ جس طرح ممکن ہو شائع فرمائیں گے، اور اپنے رسالہ کی بیس کاپیاں قیمتاً میرے پتہ پر ارسال فرمائیں گے۔

گر قبول افتد زہے عز وشرف

کفیل احمد ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حقائق

اردو زبان وادب کے ارتقاء میں دکن کا حصہ

محمد مسعود عزیزی ندوی

یہ مقالہ رابطہ ادب اسلامی کے سہ روزہ اجلاس بتاریخ ۲۳/۲۴/۲۵/ دسمبر ۲۰۱۶ء بروز جمعہ/سنیچر/اتوار منعقدہ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحمانیہ حیدرآباد کے لئے لکھا گیا تھا، قارئین کے فائدے کیلئے پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

اردو زبان کی خصوصیتیں:

انسان کا شاید سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ زبان ہے، ہم دراصل زبان کے ذریعہ اپنی ہستی کا اور اس رشتے کا اقرار کرتے ہیں جو انسان نے کائنات اور دوسرے انسانوں سے قائم کر رکھے ہیں، انسان کی ترقی کا راز بھی بہت کچھ زبان میں پوشیدہ ہے کیونکہ علم کی قوت کا سہارا زبان بھی ہے، ہم روزمرہ جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ اردو زبان ہے، جو ایک شریں زبان ہے، اور اس کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں: اردو زبان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندی، فارسی اور عربی کی تمام آوازیں موجود ہیں، اردو کے حروف ہجا ان تینوں زبانوں کے حروف ہجا سے مل کر بنے ہیں، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس زبان میں دوسری زبانوں کے لفظوں اور محاوروں کو اپنانے کی بڑی صلاحیت ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط شروع سے فارسی ہے، اردو زبان کو انیسویں صدی کی ابتداء تک ہندی، ہندوی، دہلوی، ریختہ، ہندوستانی، دکنی اور گجراتی جیسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔

لفظ اردو کی تشریح:

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی لشکر، سپاہی، کیمپ، خیمہ وغیرہ کے ہیں، عہد مغلیہ میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے، زبان کے معنی میں اس لفظ کا استعمال زیادہ پرانا نہیں، میر امن دہلوی، سرسید احمد خان اور سید احمد دہلوی (مؤلف فرہنگ آصفیہ) کا یہ دعوی کہ اردو زبان کی ابتداء شاہجہانی لشکر (اردو) سے ہوئی، اس لئے اس زبان کا نام بھی اردو پڑ گیا، درست نہیں ہے، کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے پیشتر کا کوئی شاعر، ادیب اور تذکرہ نگار اس زبان کو ''اردو'' سے تعبیر نہیں کرتا۔

زبان کے مختلف خاندان:

علمائے لسانیات نے زبانوں کو ان کی صوتی اور صرفی خصوصیات کی بنیاد پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے، سب سے بڑا خاندان آریائی زبانوں کا ہے، اس کے بعد منگول خاندان (چینی، جاپانی وغیرہ) کا نمبر آتا ہے، اور پھر سامی (عربی اور عبرانی وغیرہ) اور دراوڑی (تلگو، تامل، ملیالم، کنڑی) زبانوں کے خاندان ہیں، آریائی خاندان جو بنگال سے ناروے تک پھیلا ہوا ہے، کئی گھرانوں میں بٹ گیا ہے۔

ہندی، پنجابی، راجستھانی، سندھی آپس میں بہنیں ہیں:

ہندی کا علاقہ بہت وسیع تھا، یہ زبان ملتان سے پٹنہ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس کی بہت سی مقامی بولیاں تھیں مثلاً برج بھاشا، کھڑی بولی، اودھی، بھوجپوری، قنوجی، ہریانی وغیرہ، اور یہ زبان راجستھانی اور پنجابی سے بہت قریب تھی، مماثلت اور ہمسائیگی کے باعث ہم ہندی (مغربی اور مشرقی) پنجابی، راجستھانی اور سندھی وغیرہ کو آپس میں بہنیں کہہ سکتے ہیں۔

اردو کی ابتداء:

اردو کی ابتداء کے بارے میں ہم یقین سے فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مغربی ہندی میں فارسی کا پیوند لگا تو یہ زبان وجود میں آئی، مغربی ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقہ میں بولی جاتی تھی، اگر یہ مان لیا جائے کہ غزنوی عہد میں لاہور اور ملتان وغیرہ میں

بھی یہی زبان رائج تھی تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کی داغ بیل اسی خطے میں پڑی۔

اردو زبان کی تشکیل کا دور:

تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدی کا زمانہ اردو زبان کی تشکیل کا دور ہے، اس دور میں بقول مولوی عبدالحق اردو کٹھالی میں پڑی گل رہی تھی، ہنوز سونا نہیں بنی تھی، اس دور میں امراء اور عمائدین سلطنت نے اردو کو منہ نہیں لگایا، ممکن ہے کہ یہ لوگ گھروں میں یہی زبان بولتے ہوں، مگر ان کی تحریر اور تصنیف کی زبان مدت تک فارسی ہی رہی، یہی زمانہ تصوف اور بھگتی کے عروج کا بھی ہے، اسی دور کی اردو کی خصوصیات میں ہندی الفاظ کی بہتات تھی، عربی اور فارسی کے الفاظ خال خال پائے جاتے تھے، فارسی اور عربی کی مذہبی اور صوفیانہ اصطلاحیں استعمال کی جاتی تھیں، مگر شعراء ہندی اور سنسکرت کے ٹھیٹ الفاظ اور عارفانہ اصطلاحیں بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے، شاعرانہ بحریں اور اصناف سخن سب ہندی کے تھے۔

اسی دور کی ایک غزل بھی امیر خسرو کے نام سے مشہور ہے، جس کا پہلا مصرعہ فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں: ؎

زحال مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگا ہے چھتیاں
شبان ہجراں دراز از زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اردو زبان نے دکن میں کافی ترقی کی:

اردو زبان اور ادب نے ۳۰۰ رسال تک جتنی ترقی دکن میں کی اس کی نظیر پورے ملک میں نہیں ملتی، اسی لئے دکن کے لوگ اگر یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کے پرکھوں نے اردو کو نکھارا، بنایا، سنوارا اور اس میں ادبی شان پیدا کی تو یہ دعوی بے بنیاد نہیں ہے، قطب شاہی (گولکنڈہ: ۱۵۱۸ء-۱۶۸۷ء) اور عادل شاہی (بیجاپور: ۱۴۸۹ء-۱۶۸۶ء) دور میں اردو کو دکن میں بہت فروغ ہوا، اور وہ ملک کی سب سے مقبول زبان بن گئی۔

اردو کا فروغ مغلیہ سلطنت کے دور میں:

جب دکن کی ریاستوں کو زوال آیا اور سلطنت مغلیہ کے دور عروج میں اورنگ زیب نے بیجاپور (۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) فتح کیا تو اورنگ آباد کی رونق بڑھ گئی، اردو کا اورنگ آبادی دور دراصل ایک درمیانی کڑی ہے، جو دکن کو شمالی ہندوستان سے ملاتی ہے، اورنگ آباد کے لوگوں کی زبان میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے جو دکنی تہذیب سے بھی متاثر ہے اور اردوئے معلی سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔

اردو زبان کی تاریخ میں شاہجہاں کا عہد بڑی اہمیت رکھتا ہے، اٹھارویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے یہاں کی زبان کو ''اردوئے معلی شاہجہاں آباد دہلی'' کا لقب دیا ہے۔

اردو دہلی اور اس کے نواح کے علاقے میں پیدا ہوئی، اور علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کے حملوں کی وجہ سے دکن پہنچی، جہاں اس کو مختلف نام دئے گئے، مثلاً ہندی، ہندوی، گوجری، گجری، دکنی، مسلمانی، ترکماٹا، زبان اہل ہند، زبان دہلی، زبان ہندوستان وغیرہ، دکنی اسی اردو کا وہ قدیم روپ ہے، جو تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن اور گجرات میں پروان چڑھتا رہا۔

اردوزبان کے مختلف روپ

۱۷۰۰ء میں جب دہلی میں ''ریختہ'' کے نام سے اردو شاعری کا احیاء ہوا، تو دہلی کی زبان دکنی سے بہ اعتبار صوتیات وصرف ونحو وغیرہ کسی قدر مختلف ہوگئی اور معیاری اردو کہلائی، اور اس کی وہ شکل جو دکن میں تھی، اسے دکنی کہا جانے لگا، دکن کے اولین مراکز گجرات اور دولت آباد تھے، چنانچہ دکنی زبان ''گوجری'' اور ''گجری'' بھی کہلائی۔

ڈاکٹر چٹر جی گجری کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: دکنی کا نام گجری اس کی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنہوں نے پنجاب کے شہروں کو گجرات اور گوجرانوالہ کا نام دیا، شمالی ہندی کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کرکے دکن گئے، تو انہوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن کے لئے زندہ رکھا۔

شوکت سبزواڑی کے خیال میں : دکنی ، گجری، گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دلی سے ان علاقوں میں پہنچی ، البتہ ان میں مقامی الفاظ اورترکیبیں شامل ہوگئیں، دکنی اور گجراتی کے اس اختلاط کی وجہ یہ ہے کہ''دکنی'' کا لسانی خطہ جنوب کی مختلف ریاستوں یعنی گجرات ، مہاراشٹر، آندھرا، میسور، تامل ناڈو کے موجودہ علاقوں پر مشتمل تھا، جہاں اردو زبان کا یہ روپ دکنی کی شکل میں ترقی کرتا رہا، جو بہ اعتبار صوتیات صرف ونحو، لغت وعروض معیاری اردو سے مختلف تھا، اس کی وجہ سے بعض علماء''دکنی'' کو اردو سے علیحدہ زبان تسلیم کرنے لگے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری جنہوں نے''دکنی'' کی بازیافت میں نمایاں حصہ لیا اور محمود شیرانی، جنہوں نے اردو کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلے قلم اٹھایا''دکنی اور پنجابی'' کی جزوی مماثلتوں کی بنا پر دکنی کا ماخذ پنجابی قرار دیتے ہیں، ڈاکٹر زور ہندوستانی صوتیات میں معیاری اردو کو کھڑی بولی سے مشتق اور''دکنی'' کو''پنجابی'' سے مشتق بتاتے ہیں، لیکن ڈاکٹر چٹرجی، ڈاکٹر ژول بلاک اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کی تحقیقات کی رو سے''دکنی'' معیاری اردو کا قدیم روپ ہے، جس کا ہیولیٰ، نواح دہلی کی بولیوں، کھڑی، ہریانی اور میواتی سے تیار ہوا، دکن کا علاقہ ایک آریائی زبان مراٹھی سے بھی گھرا ہوا ہے، اس لئے ''دکنی'' نے مراٹھی اور اس سے قبل مہاراشٹری پراکرت کا خاصا اثر قبول کیا، اس کے علاوہ دراوڑی خاندان کی زبانوں، تامل، تلنگی، ملیالم، کنڑی سے گھری ہونے کی وجہ سے تلنگی، کنڑی اور تامل کے بعض الفاظ بھی دکنی میں شامل ہوگئے، لیکن ان زبانوں کے اثرات سے اردو قواعد محفوظ رہے۔

دکن میں اردو زبان کی ابتداء :

دکن میں اردو کی ابتداء علاء الدین خلجی اور ملک کافور کے حملوں سے ہوئی (۱۳۰۲-۱۳۱۳ء) مالوہ، اجین اور منڈو کو فتح کرنے کے بعد شاہی لشکر نے دکن کا رخ کیا اور دیوگیر (دولت آباد) اور وارنگل پر قبضہ کرتا ہوا راس کماری تک پہنچ گیا، خلجیوں کے بعد جونا خان نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق کے عہد میں (۱۳۲۱ء) دیوگیر، وارنگل اور بیدر کو دوبارہ فتح کیا اور وہاں اپنے نائب متعین کردیئے، پھر جب جونا خان سلطان محمد تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے ۱۳۲۷ء میں اپنا پایہ تخت دولت آباد منتقل کردیا اور دہلی کے امراء اور عمال، اہل حرفہ اور تجار، علماء وفضلا اور شاہی لشکر کو ترک وطن کرکے دولت آباد میں سکونت اختیار کرنا پڑی، دو سال بعد بادشاہ خود تو دہلی واپس چلا گیا مگر دہلی کے بکثرت باشندے دکن ہی میں آباد ہوگئے، اس طرح دکن میں اردو کی داغ بیل پڑی، دکن میں اردو کے فروغ کا ایک سبب یہ ہوا کہ حسن گنگو بہمنی نے دکنی امراء کی مدد سے ۱۳۴۷ء میں دولت آباد فتح کرلیا اور دہلی سے رشتہ توڑ کر خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ (دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۴ر لاہور ۱۹۴۰)

بہمنی فرمانرواؤں (از ۱۳۴۷ تا ۱۵۲۷ء) نے اردو کو دفتروں کی سرکاری زبان قرار دیا، سید عین الدین گنج العلم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک سو مریدوں کے ہمراہ اسی زمانے میں دکن آئے، خواجہ محمد حسین گیسو دراز نے بھی اسی عہد میں گلبرگہ میں سکونت اختیار کی۔

دکن میں ایرانی علماء اورشعراء کی آمد:

دکن پر ایرانی تہذیب کا اثر ہمایوں بہمنی اور محمود شاہ بہمنی کے وزیر خواجہ محمود گاواں کے زمانے ہی میں بڑھنے لگا تھا، محمود گاواں بڑا صاحب فضل وکمال تھا اور علم وفن کا قدر داں تھا، ایرانی امیروں اور دانشوروں کو وہ خاص طور پر نوازتا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایرانی تھا، چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی فیاضیوں اور علم پروریوں کا شہرہ سن کر ایرانی علماء، شعراء اور امراء دکن میں آتے اور دولت اور عزت سے سرفراز ہوتے، دکنی شاعروں نے فارسی کی تقلید میں اردو میں غزل کی ابتداء کی، اردو کی سب سے قدیم غزل دکنی شاعر مشتاق کی ہے، جو سلطان محمد شاہ بہمنی (وفات ۱۴۸۲ء) کے آخری زمانہ میں تھا، غزل کے دو شعر یہ ہیں:

تجھ دیکھتے دل تو گیا ہور بیوا پر بے کل گھڑی
دیکھے تو ہے جیؤ کے اوپر نیں دیکھے تو کل گھڑی

آب حیات اور لب تیرے جاں بخش وجاں پرور آہے
مشتاق بو سے سوں پیا امرت بھری او کل گھڑی

(دکنی ادب کی تاریخ: از ڈاکٹر محی الدین زور کراچی صفحہ ۱۶)

اردو زبان کا آغاز جنوبی ہند سے ہوا:

اگر اردو زبان وادب کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ تاریخی اعتبار سے جنوبی ہند میں اردو زبان نے پہلے اپنے سفر کا آغاز کیا، جنوبی ہند کے علاقوں گجرات اور دکن میں جس وقت اردو شاعری کا آغاز ہوا، اس وقت شمالی ہند میں اس کے کوئی آثار موجود نہ تھے، دکن میں اردو شاعری کا آغاز بہمنی عہد (۱۳۴۷-۱۵۲۷) میں ہو چکا تھا، اس عہد کی ادبی تاریخ، تخلیق کاروں کے سوانح اور بیش تر ادب پارے گردش ایام کے نذر ہوگئے، بہمنی عہد میں تخلیق ہونے والے اردو زبان کی شاعری کے اولین نمونے جن کی مدد سے اردو شاعری کے ارتقا کی حقیقی صورت حال کے بارے میں آگاہی ملتی ہے ان کی تعداد بہت کم ہے، دکن میں اس زبان سے تخلیق ہونے والی شاعری کے ابتدائی نمونے اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اردو شاعری کا ہیولیٰ یہیں سے اٹھا تھا، خواہ اسے کسی نام سے پکارا جائے یہ اردو شاعری کا نقش اول ہی سمجھا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر گجرات میں اردو شاعری کے اولین نمونوں کو گجری یا گجراتی زبان کی شاعری کے نمونے قرار دیا جاسکتا ہے، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اپنی اصلیت کے اعتبار سے یہی اردو شاعری کی ابتدائی شکل ہے، بہمنی دور میں دکن کو اہم تجارتی اور علمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی، تاہم اس عہد کی کوئی قابل ذکر تصنیف اب دستیاب نہیں، اس عہد کے ایک ممتاز ادیب عین الدین گنج العلم کا نام مختلف تذکروں میں ملتا ہے، لیکن اس کی کسی ایسی تصنیف کا سراغ نہیں مل سکا جو زبان دکنی میں ہو۔

بہمنی دور کی اولین اور اہم ترین تصنیف:

اس دور کی اولین اور اہم ترین تصنیف جس تک ادب کے طلباء کی رسائی ہے، وہ فخر الدین نظامی کی تصنیف ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے، مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عرصہ اقتدار (۱۴۲۱-۱۴۳۴) میں لکھی گئی، اس مثنوی کا اہم ترین موضوع سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد حکومت کے اہم واقعات اور معاملات سلطنت ہیں، اس مثنوی میں سیاسی نشیب وفراز، معاشرتی زندگی کے ارتعاشات اور سماجی مسائل کے بارے میں تاریخ کے مسلسل عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی مہارت سے لفظی مرقع نگاری کی گئی ہے، اس میں صد آفرینی کی جو کیفیت ہے اس کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے، اس عہد کے حالات نے تہذیبی اور ثقافتی زندگی اور فنون لطیفہ پر جو اثرات مرتب کئے، ان کے بارے میں یہ مثنوی ایک اہم ماخذ ہے:

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرت پال، سنسار، کرتا ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ
کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ
لقب شہ علی آل بہمن ولی
ولی تھی بہت بدھ تد آگلی

اس مثنوی میں اسلوب کے دو پہلو:

اس مثنوی میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ چھ سو سال قدیم ہے، اتنی قدیم زبان کے ذخیرہ الفاظ کو آج کے دور میں سمجھنا بلاشبہ ایک کٹھن مرحلہ ہے، اس مثنوی میں اسلوب کے دو پہلو قابل توجہ ہیں، ایک تو یہ کہ تخلیق کار نے ''ہندوی اثرات'' کو اپنے اسلوب میں پوری آب وتاب سے جگہ دی ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس مثنوی میں فارسی زبان اور اس کا لہجہ واضح طور پر مؤثر دکھائی دیتا ہے، اس طرح اسلوب میں ایک رنگ ڈھنگ کیفیت سامنے آتی ہے، لسانی ارتقاء ایک مسلسل عمل ہے، گردش ماہ وسال کے نتیجے میں زبانیں بھی اپنے ذخیرہ الفاظ میں ردو بدل اور ترک وانتخاب کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہیں، نئے نئے خیالات، متنوع اسالیب اور نئی زبانوں کے الفاظ کے اشتراک عمل میں ایک قوس

وقزح کا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے،لسانی ارتقا کی یہ کیفیت جہاں تخلیق کار کی ذاتی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے، وہاں اس کے مطالعہ سے اقتضائے وقت کے مطابق عصری آگہی کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں، مثنوی کے تخلیق کار نے اپنا پورا نام اور تخلص اپنی تخلیق میں متعدد مقامات پر لکھا ہے:

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بے دری

بھمنی دور میں پائے جانے والے رجحانات:

بہمنی دور میں جو ادب تخلیق ہوا، اس میں پائے جانیوالے درج ذیل تین رجحانات قابل توجہ ہیں، جن کی عکاسی اس عہد کے اہم تخلیق کاروں کے اسلوب میں ہوتی ہیں:

۱- زیادہ تر تخلیق کاروں نے شعوری غور وخوض سے یہ کوشش کی کہ عجائبات فطرت، عبرت آموز واقعات، لوک داستانوں ، قصوں ، کہانیوں، انوکھی باتوں یا دلچسپ موضوعات کو پرلطف انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھال کر قارئین ادب کے لئے سکون قلب اور مسرت وخوشی کے مواقع پیدا کئے جائیں۔

۲- بہمنی عہد کے اکثر تخلیق کاروں کی توجہ مذہبی اقدار وروایات، تاریخی واقعات، اور سبق آموز حکایات کو شاعری میں سمونے پر مرکوز رہی۔

۳- بہمنی عہد کے تخلیق کاروں کے اسلوب میں مذہب سے وابستگی کا عنصر غالب رہا، انہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ تصوف اور مذہبی رشد وہدایت کے اہم موضوعات کو شاعری کے توسط سے قارئین تک پہنچایا جائے، وہ سمجھتے تھے کہ شاعری ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو قارئین ادب تک ان کے خیالات کی ترسیل پر قادر ہے، تخلیق فن کے لمحوں میں بہمنی دور کے تخلیق کاروں نے ادب کے ذریعہ سے مسرت وشادمانی کے حصول کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا، ان کے ادب پاروں میں ان کی شخصیت کے اہم پہلو پوری طرح سما گئے ہیں، ان کے شخصی وقار نے تخلیقی عمل کو بھی اسی حسین رنگ میں رنگ لیا ہے، اس عہد کی مشہور اور مقبول مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں تخلیق کار کے اسلوب میں پائے جانے والے رجحانات کی چند مثالیں پیش ہیں، ان کے مطالعہ سے لسانی ارتقا کے مختلف مدارج کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے:

سنیا تھا کہ ناری دہرے بہت چھند
سومیں آج دیٹھا تری چھند پند
بڑے ساچ کہہ کر گئے بول اچوک
دودھا دود کا چھاچھہا پیوئے پھوک
مجھے مارناں مارکے گھال دے
ولے آج اکھر مار نیکال دے
جو کج کل کرنا سوتوں آج کر
نہ گھال آج کا کام توں کال پر
بھلائے کوں بھلائی کرے کچھ نہ ہوئے
برے کوں بھلائی کرے ہوئے تو ہوئے

نظامی کی ایک اور مثنوی ''خوف نامہ'' ہے، اس مثنوی میں تخلیق کار کے اسلوب میں ارتقاء دکھائی دیتا ہے، پہلی مثنوی کی نسبت اس دوسری مثنوی میں نظامی نے سادہ، سلیس اور صاف لہجہ اپنایا ہے، اس مثنوی میں شاعر نے حیات بعد الموت کے مسائل کو موضوع بنایا ہے، انہوں نے قاری کو روز محشر کے بارے میں مذہبی روایات سے مطلع کیا ہے، قیامت کے دن اعمال کی بنا پر جزاء اور سزا کا نہایت مؤثر اور دل نشین انداز میں ذکر کیا گیا ہے، شاعر نے اپنے ناصحانہ اسلوب کے ذریعہ قاری کو اخلاقیات کا درس دیا ہے، اس مثنوی میں تعلیم کو اولین ترجیح دیتے ہوئے شاعر نے افراد کے اعمال کی اصلاح کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا ہے، اس مثنوی میں تفریح کے بجائے تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

اس عہد میں زبان کی ارتقائی کیفیت کی مظہر تصانیف:

حسن شوقی کی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' (۱۵۶۴ء) اور اشرف بیابانی (۱۴۵۹- ۱۵۲۸) کی مثنوی ''نوسرہا'' اس عہد میں یہ زبان وبیان کی ارتقائی کیفیت کی مظہر تصانیف ہیں، اشرف بیابانی اپنی تصانیف ''واحد باری'' اور ''قصہ آخر الزماں'' کی شاعری میں استعمال

ہونے والی زبان کو ہندی یا ہندوی کا نام دیتا ہے:

ایک ایک بول یہ موزوں آن ۞ تقریر ہندی سب بکھا ں

تخلیقی اعتبار سے دیکھیں تو تخلیق ادب کے یہ معائر جہاں نئے حقائق کے مظہر ہیں وہاں ان کی وجہ سے جمود کا خاتمہ ہوا اور نیا لسانی نظام وجود میں آنے کے امکانات روشن ہوتے چلے گئے ،اسی عہد کے ایک شاعر میراں جی شمس العشاق (۱۴۹۴ء) نے اپنی شاعری میں تصوف کے موضوع پر نہایت دلنشیں انداز میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں، بہمنی عہد میں ان شعراء کی کاوشوں سے اردو کو پورے دکن میں زبردست پزیرائی نصیب ہوئی، ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ بہمنی عہد میں تخلیق ادب کے سلسلے میں پورے دکن میں صرف اردو ہی واحد مشترک زبان تھی جس میں تخلیق کار پرورش لوح وقلم میں مصروف تھے، دکن کے اہل قلم نے اردو نثر میں بھی سب سے پہلے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا، اخلاق وتصوف کے موضوعات پر اس عہد میں چند رسائل منصۂ شہود پر آئے ، ان رسائل کے مصنف شیخ گنج العلم ہیں، یہ رسائل بہمنی خاندان کے عہد میں دکن کی سرزمین سے تصنیف ہوئے۔

اردو زبان کی تاریخ کو سمجھنے کیلئے ادوار کی تقسیم:

زبان اردو کی تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنے کیلئے اس کو کئی ادوار میں تقسیم کرنا مناسب ہے، یہ ادوار حسب ذیل ہیں:

دور موجدین: (۱۱۹۳ء-۱۳۴۷ء) یعنی کھڑی بولی کا ادب، کھڑی بولی مسلمانوں کی آمد سے پہلے لسانی اعتبار سے پسماندہ زبان تھی، مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مدت تک وہ صرف روزانہ کاروبار اور عام بول چال کی زبان رہی۔

دور متقدمین: (۱۳۴۷ء-۱۷۵۰ء) دکن کا اردو ادب، جس کو ادبی نظم ونثر کے نمونے پیش کرنے میں اولیت حاصل ہے۔

دور متاخرین: (۱۸۰۰ء-۱۸۵۷ء)

دور جدید: (۱۸۵۷ء-۱۹۳۵ء)

دور حاضر: (۱۹۳۵ء-۲۰۱۷ء)

دکنی ادب کے کئی اہم کارنامے:

تیرہویں صدی سے سترہویں صدی تک دکنی ادب کے کئی اہم کارنامے منظر عام آئے، دکنی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ ۱۸۶۷ء تک برقرار رہا، چنانچہ ۱۸۶۷ء میں حیدرآباد کے ایک صوفی فقیر اللہ شاہ حیدر نے نہال چند لاہوری کی تصنیف ''بکاولی'' کے مقابل میں اپنی تصنیف ''تناولی'' پیش کی، باقر آگاہ اپنی مثنوی ''گلزار عشق'' کے دیباچہ میں جو ۱۷۹۶ء میں لکھی گئی ، دکنی پر کئے ہوئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان وہرزہ سرایاں زبان دکنی پر اعتراض اور ''گلشن عشق''، ''علی نامہ'' کے پڑھنے سے احتراز کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی، زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج تھی، اور طعن شماتت سے سالم تھی، اکثر شعراء وہاں کے ابن نشاطی، فراقی، شوقی، خوشنود، غواصی، ایاغی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، مہتاب وغیرہم نے اپنی زبان میں بے حساب قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات رقم کئے اور داد سخنوری کا دئے''۔

دکن میں اردو زبان کو چار ادوار پر منقسم کیا جاتاھے:

دکنی کی ترقی کا اندازہ لگانے کے لئے دکنی ادب کی تاریخ کو ان چار ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے:

پہلا دور: گجرات میں دکنی یا قدیم اردو کا چلن۔

دوسرا دور: ۱۳۲۴ء سے ۱۶۸۶ء تک، علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے حملوں کے بعد بہمینہ سلطنت کے قیام اور بہمینہ سلطنت کے سقوط کے بعد گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر کے شمالی ہند میں انضمام تک۔

تیسرا دور: اورنگ زیب کے عہد میں دکنی کا اہم مرکز اورنگ آباد تھا۔

چوتھا دور: دور آصفی، مرکز گجرات میں اس زبان کی سرپرستی حضرت عین الدین گنج العلم، شاہ علی جیوگام دھنی، بہاء الدین باجن، شیخ خوب محمد چشتی، جیسے علماء وصوفیا نے کی، شاہ علی جیوگام دھنی نے اپنی یادگار ایک اردو دیوان ''جواہر اسرار اللہ'' چھوڑا، شیخ خوب محمد نے اپنے

مرشد بہاء الدین باجن کے کلام کی شرح ''خوب ترنگ'' کے نام سے لکھی، مابعد کے زمانے میں محمد امین گجراتی کی تصنیف ''یوسف زلیخا'' قدیم اردو کی اہم تصنیف ہے، سید علی جیوگام دہنی کے کلام کو ان کے ایک شاگرد نے ترتیب دیا، اس میں ان کی شاعری کے متعلق لکھتا ہے: ''در بیاں توحید واسرار بالفاظ گجری بطریق فرمودہ'' یہ نام گجری اور گوجری دکنی کے لئے اس دور میں خاصہ مقبول رہا، چنانچہ بیجا پور کے مشہور صوفی شاہ برہان الدین جانم اپنی تصانیف ''کلمۃ الحقائق'' اور ''حجۃ البقاء'' میں دکنی کو گجری کے ہی نام سے یاد کرتے ہیں۔

بھمنی دور کے مشہور شعراء وادباء:

بہمنی دور کے مشہور شعراء اور ادباء جن کے کارنامے منظر عام پر آ چکے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

۱-حضرت عین الدین گنج العلم گجرات سے دکن تشریف لائے۔
۲-سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز۔
۳-حضرت اکبر حسینی۔
۴-حضرت عبداللہ حسینی۔
۵-نظامی-مصنف کدم راو پدم راؤ۔
۶-امیر الدین شاہ میراں جی شمس العشاق۔
۷-فیروز مصنف پرت نامہ یا توصیف نامہ میراں محی الدین۔
۸-اشرف مصنف نوسر ہار۔

قلی قطب شاہ کے لسانی تجربہ کا اہم پہلو:

قلی قطب شاہ کے دربار میں اس عہد کے متعدد نامور ادیب، شاعر اور دانش ور موجود تھے، ان میں میر محمد مومن، ملا وجہی، اور غواصی کے نام قابل ذکر ہیں، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو لسانی تجربہ کیا، اس کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے تخلیقی عمل میں کئی تہذیبوں کا سنگم دکھائی دیتا ہے، ایک زیرک تخلیق کار کی حیثیت سے اس نے ایرانی، عربی اور مقامی تہذیب وثقافت کے درخشاں پہلوؤں کو اپنے فکر وفن کی اساس بنایا، اس کے تخلیقی عمل میں فارسی شاعری کی روایت اور اسالیب پر توجہ مرکوز رہی، اس نے علم عروض، صنائع بدائع بالخصوص تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے سلسلے میں بالعموم فارسی زبان کی روایات کو پیش نظر رکھا ہے، اس کی شاعری میں اس عہد کی تہذیب ومعاشرت کی حقیقی تصویر جلوہ گر ہے۔

قلی قطب شاہ نے حسن ورومان میں ہندی روایات کو پیش نظر رکھا:

جہاں تک حسن ورومان اور عشق ومحبت کے موضوعات کا تعلق ہے، قلی قطب شاہ نے یہاں ہندی روایت کو پیش نظر رکھا ہے، اس نے اظہار محبت اور پیمان وفا باندھنے کے سلسلے میں ہندی روایت ہی کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، عشق کی ہندی روایت میں محبت کا اظہار سب سے پہلے عورت کی جانب سے ہوتا ہے، اس کے بعد وہ محبت کے دشت پر خار میں جب آبلہ پا مسافر کی طرح صدائے جرس کی جستجو میں بھٹک کر سرابوں اور سکوت کے صحراء میں آہ وفغاں کرتی ہے تو یہ بات قاری کے دل میں اتر جاتی ہے، حریف اور رقیب کے ستم تو الفاظ میں بیان کئے جا سکتے ہیں، مگر عاشق کی کج ادائی اور بے وفائی خون کے آنسو رلاتی ہے۔

قطب شاہی دور میں اردو کا فروغ اور اس عہد کے اساطین علم وادب:

بہمنی دور کے بعد قطب شاہی دور (از ۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء) میں اردو زبان وادب کے فروغ کا سلسلہ جاری رہا، جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں اس عہد کے تخلیق کاروں نے بڑی محنت اور جگر کاوی کا ثبوت دیا، اس عہد کے ادیبوں نے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے قارئین ادب کو اخلاص ومروت کا پیغام دیا۔

اس عہد کے اہم تخلیق کاروں میں باکمال تخلیق کار ملا خیالی، صاحب اسلوب سید محمود، مشہور شاعر فیروز، نامور ادیب ملا وجہی، سلطان محمد قطب شاہ، قادر الکلام شاعر ملا غواصی، سلطان عبداللہ قطب شاہ، عظیم فن کار ابن نشاطی، استاد سخن طبعی، عظیم شاعر ولی دکنی جیسے اساطین علم وادب شمار کئے جاتے ہیں۔

گولکنڈہ کے مشہور شعرا:

مختلف ادوار میں گولکنڈہ کے جن شعراء نے اپنی تخلیقی فعالیت سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ان میں قطبی، شاہ سلطان، جنیدی، ابن نشاطی، میراں جی، میراں یعقوب، بلاقی، طبعی، محبؔ، کبیر، اولیاء، غلام علی، سیوک، فائز، لطیف، شاہ راجو، فتاحی، افضل اور شاہی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مغلوں نے ۱۶۸۵ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کو فتح کرلیا تو جغرافیائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی، ثقافتی، لسانی، معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا جس نے سلطنت میں ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا، مغلیہ عہد میں دکن میں جو ادب تخلیق ہوا وہ اردو زبان کے ارتقاء کا مظہر ہے، اس عرصہ میں جو مثنویاں لکھی گئیں، ان میں شعراء کی بالعموم تصوف، اخلاقیات، حسن ورومان اور رزم اور بزم کی شان دل ربائی قاری کو مسحور کردیتی ہے، مثال کے طور پر سراج اورنگ آبادی کی مثنوی ''بوستانِ خیال'' موضوع اور اسلوب کی دل کشی کے لحاظ سے شمالی ہند میں تخلیق ہونے والی مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں، سراج اورنگ آبادی نے مثنوی بوستان خیال میں تخیل کی جولانیاں دکھاتے ہوئے اپنے کمال فن کو ادبی تخلیق میں احسن طریقے سے سمودیا ہے، قاری اسے پڑھ کر حظ اٹھاتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب کے ارتقاء میں دکن کا کیا حصہ رہا ہے، بہت سے قلمکاروں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنی اپنی تخلیقات ومعلومات سے ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو اچھا مواد فراہم کیا ہے۔

یہ مضمون غلام شبیر رانا کے ''دکن میں اردو ادب کا ارتقاء'' اور محمد خالد کے ''اردو کے فروغ میں شعراء کا کردار''، سید شہزاد ناصر کے ''اردو زبان کی ابتداء اور اس کا ارتقاء'' اور اردو انسائیکلو پیڈیا ''اردو زبان وادب'' سے مستفاد ہے۔

❀❀❀❀

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی

اہم تصانیف

۱- مختصر تجوید القرآن (بروایت حفص اردو)
۲- بچوں کی تمرین التجوید (تجوید کے قواعد، مشق اور طریقہ تدریس اردو)
۳- جیب کی تجوید (تجوید کے ضروری قواعد کا پاکٹ سائز مجموعہ)
۴- ریاض البیان فی تجوید القرآن (بروایت حفص عربی)
۵- رہنمائے سلوک وطریقت ۶- مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتہا
۷- الامامۃ فی الصلاۃ ومسائلہا واحکامہا
۸- التدخین بین الشرع والطب ۹- حیات عبدالرشید ۲۰۰/روپئے
۱۰- سیرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ ۱۱- تذکرہ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
۱۲- تذکرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳- تذکرہ علامہ سید سلیمان ندویؒ
۱۴- تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۵- چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید
۱۶- مقالات ومشاہدات ۱۷- مکتوبات اکابر
۱۸- چندہ دینے، دلوانے اور لینے کے آداب واصول
۱۹- افکار دل (۳۰/تقریروں کا مجموعہ)
۲۰- تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ
۲۱- مدارس کا نظام تحلیل وتجزیہ ۲۲- سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
۲۳- میری والدہ مرحومہ (نقوش وتأثرات)
۲۴- قادیانیت نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت ۲۵- لڑکیوں کی اصلاح وتربیت
۲۶- تذکرہ حضرت حافظ عبدالرشید رائے پوری
۲۷- نقوش حیات حضرت مولانا عبدالرحیم متالا
۲۸- ملفوظات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ
۲۹- تصوف اور اکابر دیوبند ۳۰- امامت کے احکام ومسائل
۳۱- فقہ حنفی کے مراجع اور ان کی خصوصیات ۳۲- اللہ ورسول کی محبت
۳۳- ماں باپ اور اولاد کے حقوق ۳۴- عقائد اور ارکان اسلام
۳۵- سیرۃ النبی الأکرم ۳۶- میرے شیخ ومرشد مفکر اسلام
۳۷- القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیۃ
۳۸- Rules of Raising Funds ۳۹- Beliefs and Pillars of Islam
۴۰- The Laws Pertaining to Imamat
۴۱- The Rights of Perents and children
۴۲- Guidelines for Sulook and Tareeqat
۴۳- Tasawwuf and tha Elders of Deoband
۴۴- Life Sketch of Hadhrat Thanwi
۴۵- A Biogrophy of the Noblest Nabi

ملنے کا پتہ

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور (یوپی)

Mob: 09719831058 - 09719639955

جائزہ

دکن کے چند مشہور شاعروں اور مصنفوں کا تذکرہ

حمیداللہ قاسمی کبیرنگری

تمھید:

دکن میں دراصل یکے بعد دیگرے کئی ریاستیں وجود میں آئیں، جن میں دو بڑی ریاستیں مشہور ومعرف ہوئیں، پہلی ریاست کا نام ''عادل شاہی حکومت'' جو ریاست بیجاپور کے نام سے وجود میں آئی، جس کا بانی یوسف عادل شاہ تھا، اور دوسری ریاست ''قطب شاہی حکومت'' جو ریاست گولکنڈہ کے نام سے وجود میں آئی، جس کا بانی سلطان قلی شاہ تھا جو ایران سے دکن آیا تھا، یہ دونوں ریاستیں اپنی اپنی الگ شان رکھتی ہیں، دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں اردو نظم ونثر کا فروغ غیر معمولی درجہ ہوا، اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عادل شاہی دور میں نثری تصانیف کے علاوہ شاعری نے بہت ترقی کی، اس دور کے شعراء نے ہر صنف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل، رباعی، گیت اور دوہے سب میں طبع آزمائی کی، اس دور میں پہلی بار عشقیہ اور رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں، غرضیکہ اس دور میں شاعروں کی تمام اصناف سخن کو نمائندگی ملی، جہاں تک نثری ادب کا تعلق ہے، اس کا موضوع زیادہ تر مسائل تصوف تک محدود رہا، ایسے ہی قطب شاہی سلطنت کا دور بھی صحیح معنوں میں علم وادب کی ترقی اور عروج کا دور تھا، کیونکہ ابراہیم قطب شاہ نے اہل علم وفضل کی بڑی قدردانی کی تھی جس کی وجہ سے دور دور سے اہل علم وفضل دکن میں آکر جمع ہوگئے، یہی نہیں بلکہ ریاست گولکنڈہ اور بیجاپور کی فیاضیوں اور علم پروریوں کا شہرہ سن سن کر ایرانی علماء، شعراء اور امراء تک دکن میں آئے اور دولت وعزت سے سرفراز ہوئے، دکنی شاعروں نے فارسی کی تقلید میں اردو میں غزل کی ابتداء کی، اردو کی سب سے قدیم غزل دکنی شاعر جناب مشتاق احمد کی ہے، جو سلطان محمد شاہ بہمنی کے آخری زمانہ کا شاعر تھا، پھر ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر گولکنڈہ کو محمد قلی قطب شاہ جیسا حکمراں نصیب ہوا، محمد قلی قطب شاہ کا دور کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل رہا، اس کا دور پرامن دور تھا، ایسے پرامن اور خوشحال دور میں جب بادشاہ خود شعر وشاعری کا دلدادہ ہو اور اس کے دربار میں ایک سے بڑھ کر ایک شاعر موجود ہو تو ظاہر ہے کہ دوسرے میدانوں کی طرح علم وادب کے میدان میں بھی زبردست ترقی ہوئی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہمیں ملا وجہی، ملا غواصی، ابن نشاطی، نظامی، طبعی اور ولی دکنی وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعروں اور مصنفوں کے نام ملتے ہیں، درج ذیل میں اُن ادوار کے چند شاعروں اور مصنفوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

اشرف بیابانی:

شاہ اشرف بیابانی کے آباء واجداد کا تعلق سندھ سے تھا، آپ جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے بیابانی مشہور ہوگئے تھے، ان کی تصانیف میں مثنوی ''نوسر ہار'' نمایاں حیثیت کی حامل ہے، جس میں واقعات کربلا کا ذکر ہے، ساتھ ہی امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعات کو بڑے مؤثر اور دردناک انداز میں بیان کیا ہے، اس مثنوی کے علاوہ ''لازم المبتدی'' اور ''واحد باری'' دو منظوم فقہی مسائل کے رسالے ہیں، مزید ایک اور تصنیف ''قصہ آخرالزماں'' کا بھی ذکر آتا ہے۔

شاہ میراں جی:

شاہ میراں جی بڑے عالم فاضل شخص تھے، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے بقول ''انہوں نے بیجاپور میں ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں

ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پست تک صاحب علم وفن ہوتے رہے، ان کے دوفرزندوں کے نام ملتے ہیں، ایک برہان الدین جانم اور دوسرے خواجہ عطاءاللہ''۔

شاہ میراں جی کی جو تصانیف لوگوں تک پہنچی ہیں، ان میں ''خوش نامہ''، ''خوش نغز''، ''شہادت الحقیقت'' اور ''مغز مرغوب'' جو کہ نظم میں ہیں، اور ''مرغوب القلوب'' نثر میں ہے، ان کا موضوع تصوف ہے، یہ تصانیف مریدوں اور عام طالبوں کے لئے بطور ہدایت لکھی گئی ہیں۔

شاہ برہان الدین جانم:

شاہ برہان الدین جانم شاہ میراں جی کے بڑے بیٹے اور خلیفہ تھے، انہوں نے نظم ونثر دونوں میں عارفانہ خیالات اور تصوف کے مسائل پیش کئے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں جو رسالے تالیف کئے ہیں وہ ادبی نقطہ نظر سے زیادہ لسانی اعتبار سے اہمیت حامل ہیں، اور ان سے اردو زبان کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ''ارشاد نامہ'' ان کی خاصی طویل نظم ہے، جس میں تصوف کے اہم مسائل طالب اور مرشد کے مابین سوال وجواب کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ''حجۃ البقاء''، ''وصیت الہادی''، ''سک سہیلا'' اور کئی دوہے بھی ان سے منسوب ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ:

ابراہیم عادل شاہ بیجاپور سلطنت کا راجہ تھا، اس کو شعر وسخن سے بہت گہرا تعلق تھا، وہ خود بھی موزوں شعر کہا کرتا تھا، تاریخ سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور خوش نویسی میں بھی ماہر تھا، ابراہیم عادل کو موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا، جس کا واضح ثبوت اس کی کتاب ''نورس'' ہے، جس میں ابراہیم نے مختلف رنگ راگنیوں کے تحت اپنے نظم کئے ہوئے گیت کو پیش کیا ہے۔

عبدل:

عبدل ابراہیم عادل شاہ کے دور کا مشہور شاعر تھا، ان کا اصل نام عبدالقادر یا عبدالمغنی تھا، عبدل کی صرف ایک مثنوی ''ابراہیم نامہ'' ملتی ہے، ابراہیم نامہ میں سات سو سے زیادہ اشعار ہیں، اس مثنوی میں عادل شاہ کی زندگی کے حالات قلم بند ہیں، اگر چہ یہ ابراہیم عادل شاہ کی مکمل سوانح عمری نہیں ہے، مگر اس میں اس کی زندگی کے اہم واقعات ہیں، عبدل کی اس مثنوی میں اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں، اس مثنوی کے ذریعہ اس دور کے رسم ورواج، آداب دربار ومحفل، عمارات وزیورات، سیر وشکار وغیرہ موضوعات پر قابل قدر معلومات پیش کی گئی ہیں۔

صنعتی بیجاپوری:

صنعتی کا اصل نام محمد ابراہیم تھا، صنعتی کی دو مثنویاں ملتی ہیں، ''قصہ تمیم انصاری'' اور مثنوی ''گلدستہ''۔

قصہ تمیم انصاری یہ ایک ایسی مثنوی ہے جو حضرت تمیم انصاری سے متعلق ہے، ایک دن تمیم انصاری اپنے گھر سے غائب ہو گئے اور طلسمات میں پھنس گئے اور کئی سال تک مصیبتیں جھیلتے رہے، ادبی نقطہ نظر سے صنعتی کی مثنویوں میں سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ دوسری خوبیاں بھی ہیں، مثنوی ''گلدستہ'' عشقیہ داستان ہے۔

ملک خشنود:

ملک خشنود گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا غلام تھا، جب سلطان کی پھوپھی خدیجہ سلطان کی شادی محمد عادل شاہ سے ہوئی تو ملک خوشنود بھی خدیجہ سلطان کے سامان کی حفاظت کے لئے روانہ کیا گیا، راستے میں اس نے اس عمدگی سے کام کیا کہ خدیجہ سلطان نے اسے ایک اعلی عہدے پر مامور کیا، ملک خوشنود نے متعدد غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں، اور امیر خسرو کی فارسی مثنویوں کا اردو ترجمہ بھی کیا، جس میں ''یوسف زلیخا''، ''بازارحسن'' اور ''ہشت بہشت'' شامل ہیں۔

کمال خان رستمی:

کمال خان رستمی ایک باکمال اور قادر الکلام شاعر تھا، اس نے غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ ایک ضخیم مثنوی ''خاور نامہ'' بھی لکھی، رستمی نے یہ مثنوی خدیجہ سلطان شہر بانو یعنی ملکہ عادل شاہ کی فرمائش پر

لکھی تھی، یہ مثنوی اصل میں حسام کی فارسی مثنوی ''خاور نامہ'' کا ترجمہ ہے، اس مثنوی میں ایک فرضی داستان نظم کی گئی ہے، جس کے ہیرو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں، جو کئی ملکوں کے بادشاہوں سے جنگ کرتے اور جنوں، پریوں سے مقابلہ کرتے ہیں، ان کا مقصد تبلیغ اسلام ہے، یہ مثنوی کئی اعتبار سے اہم ہے، مثلاً یہ اردو کی پہلی ضخیم رزمیہ مثنوی ہے، ضخیم ہونے کے باوجود اس میں تسلسل نہیں ٹوٹنے پاتا، اس کے علاوہ مختلف مواقع پر عادل شاہی عہد کے تہذیب ومعاشرت کے مرقع پیش کئے ہیں، اسلوب بیان بھی سادہ اور سلیس ہے، یہ مثنوی چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جسے رستمی نے ڈھائی سال کی قلیل مدت میں مکمل کیا تھا۔

حسن شوقی:

آپ کا نام شیخ حسن اور شوقی تخلص تھا، شوقی کی دو مثنویاں ملتی ہیں: ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میز بانی نامہ''۔

پہلی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' میں جنگ تلی کوٹہ کا حال بیان کیا ہے، جس میں قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں نے مل کر بیجانگر کے راجہ سے مقابلہ کیا اور اس کا خاتمہ کر کے وہاں کے علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

دوسری مثنوی ''میز بانی نامہ'' میں شوقی نے سلطان کی شہر گشت اور وزیر اعظم مصطفیٰ خان کی بیٹی کی شادی اور اس کی مہمان نوازی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ شوقی غزل گو بھی تھے۔

علی عادل شاہ ثانی:

علی عادل شاہ یہ محمد عادل شاہ کے بیٹے تھے، ان کی پرورش خدیجہ سلطان شہر بانو کی نگرانی میں ہوئی جو خود علم وادب کی پرستار اور شعراء کی قدر داں تھی، ملک خشنود اور رستمی کی صحبت نے بچپن میں ہی اس کے ذوق سخن کو نکھارا، باپ کے انتقال کے بعد ۱۰۶۷ ہجری میں تخت نشین ہوا۔

علی عادل شاہ نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی، اردو کے علاوہ ہندی، فارسی میں بھی شعر کہتا تھا، کلیات شاہی میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، مسدس، مخمس، رباعیات، گیت اور دوہے موجود ہیں، علی شاہ کی غزلوں کا اظہار واسلوب لب ولہجے میں ندرت اور بانکپن پایا جاتا ہے، اس نے تشبیہوں کو مقامی رنگ دیا اور ہندوستانی روایات اور ہندو دیومالا کو بڑی چابک دستی سے غزل میں کھپایا ہے، اس سے اس کے گہرے مشاہدے، وسیع مطالعے اور شاعرانہ باریک بینی اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید میراں ہاشمی:

سید میراں ہاشمی علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا شاعر تھا، ہاشمی مادرزاد اندھا تھا؛ لیکن بادشاہ کے دربار میں اسے خاصی مقبولیت حاصل تھی، ہاشمی نے ایک دیوان اور مثنوی ''یوسف زلیخا'' چھوڑا، اس کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی کو دکن کی عورتوں کی زبان پر عبور حاصل تھا، اس کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلیں بھی موجود ہیں، اس لئے کچھ لوگ اسے ریختی کا موجد قرار دیتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ:

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا پانچواں فرمانرواں تھا، محمد قلی شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے، جس نے پچاس ہزار اشعار کہے، بقول ڈاکٹر محی الدین قادری: ''وہ اردو زبان وادب کا محسن اعظم ہے''، انتظام سلطنت کے بعد اسے اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی تو اردو سخن ہی تھا، اس نے ابتدائی ایام میں اردو کی سرپرستی کی اور اسے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنا کر ایک نئی توانائی بخشی، قطب شاہ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی؛ لیکن اس کی غزلیں خاص طور سے قابل توجہ ہیں، ان غزلوں میں ہندی اثرات ہونے کی وجہ سے اظہار محبت عورت کی طرف سے ہے، اس کی غزل میں سوز وگداز بھی ہے اور جذبات کی بے ساختگی بھی ملتی ہے، اس نے غزل کے موضوعات میں اضافہ کیا اور اسے محض غم جاناں تک محدود نہیں رکھا۔

محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے، اس نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں، اس کے دیوان میں نیچرل شاعری کا

بڑا ذخیرہ موجود ہے، اس کے یہاں ہلال عید، ترکاری، پھل، پھول، سالگرہ، رسم جلوہ اور دیگر رسومات مثلاً شادی بیاہ، شب معراج، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ وغیرہ پر بھی نظمیں ملتی ہیں، جو اس وقت کے دکن کی مکمل تصویر کشی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

سلطان محمد:

سلطان محمد گولکنڈہ کا چھٹا حکمراں تھا، جو قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا، قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد بلاشرکت غیرے تخت نشین ہوا، وہ خود شاعر تھا؛ لیکن نغمہ اور عشقیہ شاعری سے پرہیز کرتا تھا، اس نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے، اسے علم وفضل اور تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا، اس کی شاعری پر بھی تصوف، مذہب اور فلسفہ کا اثر نمایاں تھا، وہ اپنا تخلص ''ظل اللہ'' رکھا تھا۔

سلطان عبداللہ:

سلطان عبداللہ گولکنڈہ کا ساتواں حکمراں تھا، اس کی عادات وخصائل اپنے نانا قطب شاہ سے بہت ملتی جلتی تھیں، چنانچہ اس کے عہد میں وہ تمام رنگ رلیاں اور تقاریب پھر سے جاری ہوگئیں جو سلطان محمد کے عہد میں منسوخ تھیں، سلطان عبداللہ کو شعر وسخن سے بہت زیادہ لگاؤ تھا، اس نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے، اس نے موسیقی کے متعلق بھی ایک کتاب لکھی، سلطان نے حافظ کی غزلوں کے ترجمے بھی کئے، ان کے یہاں متعلقات حسن کا ذکر کثرت سے ہے، اس کے اشعار میں مغل دور کے جمالیاتی طرز احساس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ملا غواصی:

ملا غواصی ایک قادرالکلام شاعر تھا، جو گولکنڈہ کا ملک شعراء سمجھا جاتا ہے، محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ملا وجہی کو غواصی کے شاعرانہ کمال نے حسد میں مبتلا رکھا، اور اسے دربار سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، جس کی وجہ سے قلی قطب شاہ کے دربار میں غواصی کو اپنے کمال کی داد نہ مل سکی، مگر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی غواصی نے اپنی مثنوی ''سیف الملک وبدیع الجمال'' میں معمولی ردوبدل کرکے اسے سلطان کی خدمت میں پیش کردیا، چنانچہ غواصی کو ملک الشعراء بنادیا گیا، غواصی کی دوسری مثنوی ''طوطی نامہ'' پہلی مثنوی سے زیادہ ضخیم اور دلچسپ ہے، یہ دراصل فارسی کے ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہے، طوطی نامہ کی زبان اس کی پہلی مثنوی سے زیادہ سلیس اور دلکش ہے، مگر شاعرانہ خصوصیات اور نزاکتیں پہلی مثنوی میں زیادہ ہیں، اس کے علاوہ غواصی کے کلام میں غزل، قصیدہ اور مرثیہ بھی ملتے ہیں۔

ملاوجهی:

محمد قلی قطب شاہ کے ہم عصر شعراء میں ملا وجہی سب سے بڑا شاعر ہے، وجہی کا سب سے بڑا کارنامہ اردو پہلی نثری کتاب ''سب رس'' ہے جو فتاحی نیشاپوری کی کہانی ''حسن ودل'' کا اردو ترجمہ ہے، ''سب رس'' کئی حوالوں سے بہت اہم کتاب ہے، اس کی عبارت مسجع ومقفیٰ ہے، لیکن اردو انشائیہ نگاری کے ابتدائی خطوط میں ملا وجہی کے یہاں ہمیں اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔

وجہی نے ۱۴۰۰ء عیسوی میں ایک مثنوی ''قطب مشتری'' کے نام سے لکھی، اس میں اس نے بھاگ متی کے ساتھ بادشاہ کے عشق کی داستان بیان کی ہے، مگر صاف صاف نام لکھنے کی بجائے بھاگ متی کی جگہ مشتری لکھا اور اسے بنگال کی شہزادی بتایا ہے، قطب مشتری وجہی کے شاعرانہ کمال کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس میں زبان کی برجستگی اور صفائی کے علاوہ مرقع نگاری کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں، جن سے اس دور کی مجلس اور تہذیبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

نصرتی:

آپ کا نام محمد نصرت اور ''نصرتی'' تخلص تھا، نصرتی نے بیجاپور کے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، علی عادل شاہ کے زمانے میں وہ شہید ہوئے، ان کی چار کتب کا پتہ چلتا ہے: ''گلشن عشق، علی نامہ، سکندر نامہ اور کلیات نصرتی''۔

''گلشن عشق'' ایک عشقیہ مثنوی ہے، جس میں کنور منوہر اور مدماتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے، ''علی نامہ'' علی عادل شاہ کی سوانح عمری ہے، جس

میں نصرتی کے قصائد بھی شامل ہیں۔

نصرتی کی دونوں مثنویاں اس کے کمال فن اور قدرت کلام کی بہترین شہادتیں ہیں، نصرتی کی تیسری مثنوی ''سکندر نامہ'' ہے، اس میں سکندر عادل شاہ کی وفات پر شیواجی اور عادل شاہی فوجوں کے درمیان لڑائی ہوئی اس کا ذکر ہے، لیکن اس میں ''علی نامہ'' اور ''گلشن عشق'' جیسا زور بیان اور شگفتگی نہیں، نصرتی صرف مثنوی نگار نہیں تھا بلکہ ایک باکمال غزل گو بھی تھا، اگر چہ اس کی غزل بہت کم تعداد میں میسر ہے، تاہم اس کی غزل میں بے ساختگی، سلاست اور روانی محسوس ہوتی ہے۔

ابن نشاطی:

شعرائے گولکنڈہ میں ابن نشاطی ایک عظیم فنکار کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی زندگی کے حالات بہت کم لوگوں کے سامنے آئے، چونکہ وہ ایک گمنام قسم کا شاعر تھا ''پھول بن'' ان کی لافانی مثنوی ہے، جس سے اس کے بارے میں کچھ کچھ اشارے ملتے ہیں، نشاطی نہ صرف شاعر تھا بلکہ انشاء پرداز بھی تھا، وہ درباری شاعر کی بجائے ایک عوامی فنکار تھا جو دربار سے زیادہ عوام میں مقبول تھا، زبان کی سادگی اور سلاست کے اعتبار سے مثنوی ''پھول بن'' شاعری کا اچھا نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

طبعی:

طبعی ابن نشاطی کے بعد حیدرآباد کا سب سے بڑا استادِ سخن گزرا ہے، ابن نشاطی کی طرح وہ بھی آزاد انسان تھا، اس نے بھی دربار سے کوئی تعلق نہ رکھا، طبعی نے ۱۰۷۱ عیسوی میں مثنوی ''بہرو گل اندام'' لکھی جو دکنی اردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے، زبان کی سلاست قابل داد ہے، اس کی یہ مثنوی نہ صرف زبان کے اعتبار سے بلکہ ادبی اعتبار سے فن کے اعلیٰ نمونوں میں شمار ہوتی ہے، طبعی نے شاعرانہ تشبیہات واستعارات میں مقامی اور فارسی دونوں روایتوں کو ملادیا ہے۔

ولی دکنی:

آپ کا اصل نام نزاعی ہے؛ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے آپ کا اصل نام ولی محمد تسلیم کیا ہے، ولی کو بلاشبہ جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ اردو کے عظیم شعراء میں شمار کیا جاسکتا ہے، بلکہ عابد علی عابد نے صرف ولی کو اردو شاعری میں ''کلاسک'' کی مثال تسلیم کیا ہے، دکنی شعراء نے غزل کے ڈھانچے کو تو اپنایا لیکن اس کے مزاج سے پوری طرح شیر وشکر نہ ہوسکے، چنانچہ ان کی غزل پر ہندی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں، لیکن ولی نے لسانی اجتہاد سے کام لیتے ہوئے فارسی شاعری کا بغور مطالعہ کیا، غزل کے مزاج کو سمجھا اور فارسی غزل سے استفادہ کرتے ہوئے اردو غزل کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا، ولی نے نہ صرف مضامین کو وسعت دی بلکہ لسانی اعتبار سے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

فخر الدین نظامی:

فخر الدین نظامی دکن کا ایک مشہور ومعروف مؤرخ وشاعر تھا جنہوں نے سب سے پہلے ایک مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' تصنیف کی اس مثنوی کا اہم ترین موضوع سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد حکومت کے اہم واقعات اور معاملات سلطنت ہیں، اس مثنوی میں سیاسی نشیب وفراز، معاشرتی زندگی کے ارتعاشات اور سماجی مسائل کے بارے میں تاریخ کے مسلسل عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی مہارت سے لفظی مرقع نگاری کی گئی ہے، اس مثنوی میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ چھ سو سال قدیم ہے، اتنی قدیم زبان کے ذخیرہ الفاظ کو آج کے دور میں سمجھنا بلاشبہ ایک کٹھن مرحلہ ہے۔

فیروز:

فیروز ایک مشہور شاعر تھا جو گولکنڈہ میں رہتے ہوئے اردو شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، فیروز نے اپنی مثنوی ''توصیف نامہ'' میں اپنے پیرومرشد اور مخدوم جناب جی جگ منے صاحب کو خراج عقیدت پیش کی ہے، اور اپنی عقیدت وجذبات کے موتی لٹائے ہیں، ان سب کے علاوہ دکن میں اور بہت سے شعراء اور مصنّفین پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے علم کا لوہا منوایا۔

ہونہار بروا

تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

مولانا کفیل احمد ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تمہید:

مولانا امتیاز احمد ندوی مرحوم ومغفور کے جدامجد شیخ حسن صاحب علیہ الرحمہ عراق کی سرزمین ''کرخ'' سے تلجہ نامی گاؤں میں رشد و ہدایت اور دعوت وتبلیغ کی سوغات لیکر آئے، اسی گاؤں سے یہ خاندان پھیلا، اس خاندان کے بہت سے سورما جنگ آزادی میں اپنے تن من دھن کی بازی لگائی، مولانا امتیاز احمد صاحب کی ننہالی رشتہ میں پرنانا محبّ اللہ شہید مرحوم کوانگریزوں نے قیدوبند کی سزادی، وہ جیل میں بآواز بلنداذان دیتے اورنماز پڑھتے تھے، انگریزوں کے دئے ہوئے کھانے کوتناول فرمانے سے انکار کردیا تھا اور چند دنوں میں ہی رب حقیقی سے جاملے، دادیہالی رشتہ میں ولی محمد کوانگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں پھانسی کی سزادی، اسی بہادر خاندان کے چشم وچراغ مولانا امتیاز احمد ندوی تھے، جنھوں نے ۱۵/دسمبر ۱۹۷۷ء میں ضلع بستی کی مردم خیز سرزمین سمریاواں بازار (موجودہ، سنت کبیرنگر) میں آنکھیں کھولیں۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی اورمکتبی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں حاصل کی، پھر آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا، چونکہ آپ کے نانا مرحوم ماسٹر عبدالمجید دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علماء وفضلا کے قدرداں اوران کے دلدادہ تھے، اس لئے حافظ امتیاز صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پررونق فضا میں حفظ وقراءت کی تکمیل کی، اس کے بعد ندوہ ہی میں عربی کی تعلیم عالمیت تک حاصل کی، نانا مرحوم تعلیم نسواں کے قائل تھے اوراس کے پرزور مؤید تھے، علاقہ میں انہوں نے عملاً اپنی بیٹیوں کو زیورتعلیم سے آراستہ کرکے ایک راہ ومنہج قائم کیا، ہمارا علاقہ علماء ومشائخ اور دعاۃ سے پرتھا اورسب کی خواہش تھی کہ پورب کے اضلاع میں تعلیم نسواں کا دینی وعصری مرکز قائم ہو جوندوۃ العلماء کے جامع نصاب تعلیم کا حامل ہو، اس خواب کو حافظ امتیاز احمد ندوی نے شرمندۂ تعبیر کردکھایا، جس عزم کا وہ اظہار اپنی طالب علمی کے دوران رفقاء سے کرتے رہتے تھے، انہوں نے عملاً کرکے دکھایا، ہرمکتب فکر کے علماء ومشائخ نے انہیں داد تحسین دی اورخوب دعاؤں سے نوازا۔

امامہ للبنات الاسلامیہ آپ کا لازوال کارنامہ:

۲۰۰۱ء میں تعلیم کی تکمیل کے بعد جولائی ۲۰۰۲ء میں کرایا کی عمارت میں ''جامعہ امامہ للبنات الاسلامیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، دوسال کے بعد زمین خرید کر اپنے مربی ومحسن، مشفق استاد حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے دست مبارک سے جامعہ کا سنگ بنیاد رکھوایا، استادمرحوم نے جمعہ کے دن جم غفیر کی موجودگی میں دعا کرائی، اللہ رب العزت نے حضرت کی دعا کوقبولیت سے نوازا، جامعہ روز بروز برگ وبار لا رہا ہے، خلوص نیت کے ساتھ لگایا ہوا درخت خوب پھل پھول رہا ہے، جامعہ کے مؤسس وبانی کی عمرعزیز کوکل ۳۸/ بہاریں اللہ رب العزت نے مقدر کی تھیں، اس سولہ سال کے عرصہ میں انہوں نے تعلیم نسواں کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے، ان کوکام کرنے کی مدت جوملی وہ صرف سولہ سال پرمحیط ہے، مرحوم کی زندگی ان کی جدوجہد سے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ان کو ہروقت یہ لگن ہوکہ وقت کم ہے اورکام زیادہ ہے، اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ شب وروز کام کرتے رہے، کم وقت میں انہوں نے لمبی مسافت طے کی، موصوف کے قائم کردہ ادارہ میں اس وقت پانچ سو طالبات زیرتعلیم

ہیں، ۱۱۰/ طالبات دارالاقامہ میں مقیم ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں طالبات ادارہ سے فراغت حاصل کرچکی ہیں، جو دینی تعلیم اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں مصروف اور سرگرم عمل ہیں، مرحوم کی ناگہانی وفات سے علاقے کا ہر فرد لرزاور کانپ گیا، چھوٹا ہو یا بڑا سب تڑپ اٹھے۔

مولانا امتیاز صاحب کی غرباء پروری:

مولانا امتیاز احمد ندوی مرحوم ایک عالم باعمل ہونے کے ساتھ ایک قائد اور سماجی کارکن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے امیر وغریب، رئیس وفقیر سب سے تعلقات تھے، برادر وطن ہندو بھائیوں سے بھی بہتر تعلق رکھتے تھے، غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی بے لوث خدمت کرتے تھے، بڑے فیاض وسخی تھے، ہر رمضان کے اخیر عشرہ میں فقراء ومساکین اور کمزوروں کے درمیان عید کی تیاری کے لئے توشہ تقسیم کیا کرتے تھے جس کا مستحقین سال بھر انتظار کرتے تھے، ان کی عید کی خوشیاں دوبالا کرتے۔

مولانا امتیاز صاحب کی قابل رشک موت:

گزشتہ مہینہ کے اوائل میں سمریاواں میں گیارہ اضلاع کا اجتماع ہونے والا تھا، نوجوان، بوڑھے، اہل دعوت اس کی تیاری میں مشغول تھے، اس اجتماع کی کامیابی میں مرحوم اوران کے ساتھیوں نے بھر پور حصہ لیا، ایک لاکھ کی تعداد میں فرزندان توحید جمع ہوئے، اجتماع کی کامیابی کے بعد دس دن کے لئے بارہ رفیقوں کے ساتھ جماعت میں نکل گئے، بہرائچ میں وقت لگایا اور دہلی میں بھی اس شرکت کے بعد یہ عزم لیکر واپس ہوئے کہ اپنے جامعہ کو مستورات کا دعوتی مرکز بنانا ہے، ان کے رفقاء نے شہادت دی کہ کسی دن ان کو تہجد کے لئے جگانا نہیں پڑا، جب آنکھ کھلتی تہجد میں مشغول نظر آتے، دلی سے گھر کے لئے روانہ ہوئے کبھی کبھی بخار آجایا کرتا تھا، میرے بیٹے نبیل احمد نے اصرار کیا کہ ماموں لکھنؤ میں اتر کر علاج کرالیں، علاج شروع ہوا دو دن میں چلتا پھرتا انسان ڈھیر ہوگیا: ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

دراصل ان کو ڈینگو بخار ہوگیا تھا، جس کا پتہ دو دن قبل ہوا، قابل اطمینان علاج کے لئے سہارا ہاسپٹل میں داخل کیا گیا، مشیت ایزدی کے سامنے ہر تدبیر اور علاج ومعالجہ ناکام ہوتا رہا، آخر ۱۶/نومبر شام کے سورج کے ساتھ یہ درِ نایاب، آفتاب وماہتاب حالت سفر میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا: ؎

موت اس کی ہے کرے جس پر زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

تدفین اور علماء کرام کے تأثرات:

۱۷/نومبر جمعرات کے روز تقریباً ۱۰/بجے تدفین کا اعلان ہوا، علاقہ کے سارے اسکول، مدارس ومکاتب سوگ میں بند ہوگئے، دکانداروں نے قصبہ میں ساری دکانیں بند کردیں، جنازہ میں فرزندان توحید کا سیلاب اڈ پڑا، کئی علماء نے اس موقع پر خطاب کیا، راقم سطور اور علاقہ کے امیر جماعت مولانا محمود احمد قاسمی نے خطاب کیا اوران کے رفیق خاص تعلیم سفر وحضر کے مولانا نجیب الحسن صدیقی ندوی نے مؤثر خطاب کیا، مرحوم سے تعلق اوران کے اوصاف اور کارناموں پر روشنی ڈالی، فرزندان توحید وعلماء ومشائخ نے یہ شہادت دی کہ حافظ امتیاز احمد کو دعوت کے راستہ میں موت آئی ہے، اللہ نے انہیں شہادت سے سرفراز کیا ہے، ان کیلئے، ان کے پسماندگان کیلئے یہ فال نیک ہے، زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو، فرزندان توحید، اہل خاندان، اعزہ واقرباء روتے، بلکتے اور سسکتے ہوئے پرنم آنکھوں کے ساتھ آبائی قبرستان میں دفن کردیا۔

پسماندگان:

آپ کے پسماندگان میں آپ کی اہلیہ محترمہ رقیہ سلمہا کے علاوہ دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں، جس میں ایک لڑکے کی ولادت آپ کے انتقال کے آٹھ دن بعد ہوئی، ان کا نام عبداللہ امتیاز رکھا گیا، اللہ تعالی سب کو صحت وسلامتی دے اوران کا سچا جانشین بنائے۔ آمین

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

غور وفکر

والدین جنت کی شاہ کلید

مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی، زامبیا، افریقہ

خوش قسمت اولاد:

وہ اولاد نہایت ہی خوش قسمت ہے جس نے اپنے والدین کو عقل وشعور میں پایا اوران کی خدمت کر کے جنت کی شاہ کلید حاصل کرلیا، والدین کا رشتہ ایک ایسا عظیم رشتہ ہے جو سب سے زیادہ حسن سلوک، عزت وتوقیر، اطاعت وفرمانبرداری، احسان واکرام اورادب واحترام کا متقاضی ہے، والدین ایک عظیم نعمت اورعطیہ ربانی ہیں، زجروتوبیخ کرنا اورڈانٹ ڈپٹ کرنا تو دور کی بات، اسلام نے انہیں اف بھی کہنے کی اجازت نہیں دی ہے، ایک مطیع وفرمانبرداراورصالح اولاد کی یہ ذمہ داری ہے کہ والدین کے سامنے متواضعانہ انداز میں پیش ہواوران کے حکم کو بجالائے۔

بدقسمت اولاد:

آج لوگ والدین کے حقوق کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اور بسا اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ والدین کے مقابلے میں جانوروں کو ترجیح دیتے ہیں، آج یورپی ممالک بلکہ بہت سے ایشیائی ممالک میں بھی جو لوگ ''فادرس ڈے'' اور''مادرس ڈے'' مناتے نہیں تھکتے، ان کا حال یہ ہے کہ والدین کو بڑھاپے میں''اولڈ ایج ہاؤس'' میں پہنچا دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ والدین بڑھاپے میں اپنی اولاد اور بچوں کے زیادہ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں، ایسے وقت میں ان کو ایسی جگہ پر پہنچا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک تو بڑھاپے اوردوسرے اولاد کی جدائی کے صدمہ میں ڈپریشن کے مریض ہوجاتے ہیں، یہ نام نہاد مہذب یورپی ممالک کے لوگ جو اپنے والدین کے حقوق ادا نہیں کرپاتے، دوسروں کو حقوق انسانی کا درس دینے میں ذرہ برابر بھی شرم وعار محسوس نہیں کرتے، ان ممالک میں ایک شخص اپنے پالتو کتے کے حقوق کی رعایت، اپنے والدین کے حقوق سے زیادہ کرتا ہے، اسی طرح کی اولاد کو بدقسمت نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

اویس قرنی رحمہ اللہ:

اسلامی تاریخ میں ایک شخص اویس بن عامر قرنی یمنیؒ کے نام سے جانے جاتے ہیں، وہ بڑے متقی وزاہد اور خیر التابعین تھے، انہوں نے عہد نبوی پایا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کرسکے، وجہ یہ تھی وہ اپنی والدہ کی خدمت کیلئے تنہا تھے اور کوئی دوسرا نہ تھا، جو ان کی خدمت کرتا، لہٰذا والدہ کی خدمت میں رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نہ کرسکے اور نہ ہی صحبت نبویؐ سے شرفیاب ہوسکے، یہ ہے حسن سلوک اور والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کا عظیم نمونہ۔ (حلیۃ الاولیاء صفحہ ۸۷، جلد ۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اویس قرنی کو''خیر التابعین'' سے تعارف کرایا، امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں، تابعین میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جسے اویس کہا جاتا ہے، اس کی ماں ہے، جس کے جسم میں (برص کے) سفید داغ ہیں، تم ان سے کہو کہ وہ تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے۔

اسلام ایک متوازن اور معتدل دین ہے، اس دین میں سب کے حقوق کی خوب رعایت کی گئی ہے، قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنے کا جو حکم آیا ہے، ہم اسے ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔

والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو:

اللہ سبحانہ تعالی کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے''۔ (سورۃ عنکبوت آیت ۸)

اللہ سبحانہ وتعالی نے اس آیت کریمہ میں انسان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس حکم کو اللہ تعالی نے ''وصینا'' سے تعبیر کیا ہے، وصیت کہتے ہیں کسی شخص کو کسی عمل کی طرف

بلانے کو، جب کہ وہ بلانا نصیحت اور خیر خواہی پر مبنی ہو‘‘۔(معارف القرآن)

والدین کو ’’اف‘‘ بھی مت کھو:

ایک جگہ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ والدین کو’’اف‘‘ بھی نہ کہا جائے:’’اور تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم ماں باپ کیساتھ حسن سلوک کیا کرو، اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جاویں، سوان کو کبھی ’’اف‘‘ بھی مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کیساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمایئے، جیسا کہ انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا اور پرورش کیا ہے‘‘۔(سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۳/۲۴)

والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو:

قرآن کریم میں ایک جگہ فرمان خداوندی ہے :’’ اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو‘‘۔

اس آیت میں لفظ’’احسان‘‘ لایا گیا ہے، جس کے عام مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ حسب ضرورت ان کے نفقہ میں اپنا مال خرچ کریں اور یہ بھی ہے کہ جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق جسمانی خدمات انجام دیں، یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو میں سخت آواز سے یا بہت زور سے نہ بولیں جس سے ان کی بے ادبی ہو، کوئی ایسا کلمہ نہ کہیں جس سے ان کی دل شکنی ہو، ان کے دوستوں اور تعلق والوں سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کریں جس سے والدین کی دل آزاری ہو، بلکہ ان کو آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کیلئے جو صورتیں اختیار کرنی پڑیں وہ سب کریں، یہاں تک اگر ماں باپ نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی بھی کی ہو جب بھی اولاد کے لئے بدسلوکی کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔(معارف القرآن جلد۲ صفحہ ۴۱۰)

والدین کی شکر گزاری کیا کرو!:

اللہ تعالیٰ انسان کو والدین کی شکر گزاری اور اچھائی و حسن سلوک کی وصیت و تاکید کرتے ہوئے ماں کے حمل کی مشقت و تکلیف اور پھر دودھ پلانے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:’’اور ہم نے انسان کو انکے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر‘‘۔(سورۂ لقمان آیت ۱۴)

یہاں جب کہ والدین کے حقوق اور ان کی شکر گزاری کا حکم دیا گیا تو اس کی حکمت یہ بتلا دی کہ اس کی ماں نے اس کے وجود و بقاء میں بڑی محنت برداشت کی ہے کہ نو مہینے تو اس کو اپنے شکم میں رکھ کر اس کی حفاظت کی اور اس کی وجہ سے جو روز بروز اس کو ضعف پر ضعف اور تکلیف پر تکلیف بڑھتی گئی، اس زحمت کو برداشت کی، جس میں ماں کو خاصی محنت بھی شب و روز اٹھانی پڑتی ہے اور اس کا ضعف بھی اس سے بڑھتا ہے اور چونکہ بچے کی پرورش میں محنت و مشقت زیادہ ماں اٹھاتی ہے اس لئے شریعت میں ماں کا حق باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے‘‘۔

نماز کے بعد والدین کا درجہ:

شریعت اسلامیہ میں نماز کو ایک بڑا استون قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کا درجہ رکھا گیا ہے، لہٰذا جب بھی والدین ہمیں اپنی خدمت اور کسی بھی غرض سے بلائیں ہمیں بغیر کسی تاخیر کے انکی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:’’ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون سا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا’’نماز وقت پر ادا کرنا، انہوں نے سوال کیا پھر کون سا عمل؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:’’والدین کے ساتھ نیکی کرنا‘‘انہوں نے پھر سوال کیا، پھر کون سا عمل؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب مرحمت فرمایا:’’اللہ کے راستے میں جہاد کرنا‘‘۔(بخاری شریف حدیث نمبر ۵۹۷۰)

والدہ احسان کی سب سے زیادہ مستحق:

والدہ حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک سائل کے سوال کے جواب میں تین بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدہ کو حسن رفاقت اور حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق بتلایا ہے، اس حدیث شریف کی

وضاحت میں علماء کرام نے یہ لکھا ہے کہ حسن سلوک کے حوالے سے ماں کا درجہ باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے، وہ اس لئے کہ ماں تین ایسی مشقتیں برداشت کرتی ہیں جو باپ نہیں کرتا، وہ مشقتیں یہ ہیں:

حمل کی مشقت، بچہ جننے کی مشقت اور دودھ پلانے کی مشقت۔

حدیث کے راوی حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! میری حسن رفاقت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری ماں''، اس نے سوال کیا: پھر کون ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری ماں'' پھر اس نے عرض کیا، پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''تمہاری ماں'' پھر اس نے عرض کیا، پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''تمہارا باپ''۔(بخاری حدیث نمبر ۵۹۷۱)

مشرکہ ماں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرو!:

اگر کسی کے والدین کافر و مشرک ہوں، اس صورت میں بھی اسلام حسن سلوک سے نہیں روکتا، بلکہ حکم کرتا ہے کہ ان کے ساتھ بھی اچھے اخلاق سے پیش آؤ، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ ''قتیلہ'' جو کہ مشرکہ تھیں، بیٹی کے پاس کچھ ضرورت کی وجہ سے آئیں، اس حوالے سے بیٹی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کروایا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''صلہ رحمی'' کا حکم صادر فرمایا، حدیث کا ترجمہ ذیل میں ہے۔

''عہد رسالت میں میری والدہ میرے پاس آئی جب کہ وہ مشرکہ تھیں، تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ طلب کرتے ہوئے عرض کیا کہ میری ماں کسی کام سے آئی ہیں، کیا میں اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب عنایت فرمایا: ''ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو''۔(بخاری شریف حدیث نمبر ۲۶۲۰)

والدین کی رضا میں اللہ کی رضا:

ایک حدیث شریف میں اللہ کی رضا کو والدین کی رضا کے ساتھ لازم کردیا گیا ہے، اگر والدین راضی ہوں تو اللہ بھی راضی اور اگر والدین ناراض ہوں تو اللہ بھی ناراض، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رب کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے''۔(ترمذی شریف حدیث ۱۸۹۹)

والدین کے دوست کیساتھ حسن سلوک:

اسلام میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور عزت و اکرام کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ان کے عزیز و اقارب اور دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ بھی توقیر و تعظیم اور حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بہت بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے''۔(مسلم شریف حدیث ۲۵۵۲)

والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے:

والدین کی نافرمانی کو اکبر الکبائر (بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ) میں شمار کیا گیا ہے، گناہ تو خود ایسا گناہ ہے کہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتا، پھر وہ گناہ جو اکبر الکبائر ہو اس کی شناعت و قباحت کتنی ہوگی، ایک حدیث شریف میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے فوراً بعد والدین کی نافرمانی کو اکبر الکبائر میں شمار کیا ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہایت ہی بڑے کبیرہ گناہ نہ بتادوں؟ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا، پھر آپ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، اچانک ٹیک چھوڑ کر سیدھے ہوگئے اور فرمایا: ''خبردار! جھوٹی بات کہنا اور جھوٹی گواہی دینا''۔(بخاری شریف حدیث ۵۹۷۶)

دوسروں کے والدین کو بھی برا مت کہو!:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے والدین کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، مگر دوسروں کے والدین کو گالی گلوچ کرتا ہے، پھر جواب میں دوسرا شخص بھی اس کے والدین کو گالی دیتا ہے، اس لئے نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اگر کسی کے ماں باپ کے ساتھ سب وشتم کرتے ہو، پھر جواب میں وہ تمہارے والدین کے ساتھ سب وشتم کرتا ہے، تو یہ ایسا ہے کہ گویا تم خود اپنے والدین کو گالی گلوچ کر رہے ہو، جب کہ والدین کے ساتھ گالی گلوچ کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آدمی اپنے والدین کو گالی دے گا، آپؐ نے فرمایا ہاں! وہ کسی کے باپ کو گالی دے، پھر وہ اس کے باپ کو (جواب میں) گالی دے اور یہ اس کی ماں کو گالی دے، پھر وہ (جواب میں) اس کی ماں کو گالی دے''۔ (مسلم شریف حدیث ۱۴۶)

ناک خاک آلود ہو:

ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کیلئے بدنصیب وبدقسمت اور ناک غبار آلود ہونے کی بددعا فرمائی ہے، جس نے اپنے ماں اور باپ دونوں کو یا پھر ان میں سے ایک کو کبرسنی میں پانے کے باوجود ان کی خدمت کر کے اور ان کی دعا کی بدولت جنت کا مستحق نہ بن گیا ہو، والدین تو ہمیشہ حسن سلوک اور حسن رفاقت کے حق دار ہیں، لیکن بڑھاپے میں وہ اپنے اولاد کی خدمت کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں، لہٰذا اولاد کو بھی چاہئے کہ والدین کے ساتھ بڑھاپے میں زیادہ حسن سلوک کریں، یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں بڑھاپے کا ذکر ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: ''اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جائے'' آپ سے پوچھا گیا کہ وہ کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا، جس نے اپنے والدین میں سے یا ایک یا دونوں کو بڑھاپے میں پائے پھر وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوا''۔ (مسلم شریف حدیث ۲۵۵۱)

والدین کی وفات کے بعد ان کے حقوق:

اسلامی تعلیمات کے مطابق والدین کے حقوق صرف ان کی حیات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ جب وہ انتقال کر جائیں اس کے بعد بھی ان کے حقوق ہیں، بنوسلمہ قبیلہ کا ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس حوالے سے اس نے سوال کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے بعد بھی والدین کے حقوق شمار کرائے، حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ ساعدیؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ قبیلہ بنوسلمہ کا ایک شخص آپ کے پاس آیا، پھر اس نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میرے والدین کی موت کے بعد کوئی ایسی نیکی باقی ہے کہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کر سکوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! ان کے لئے دعا کرنا، ان کے لئے استغفار کرنا، ان کے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرنا، ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور ان کے دوستوں کی عزت کرنا''۔ (ابوداؤد شریف حدیث ۵۱۴۲)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ والدین کی موت کے بعد ہمیں ان کیلئے دعا کرنا چاہئے، استغفار کرنا چاہئے، ان کے وعدوں کو پورا کرنا چاہئے، ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنی چاہئے اور ان کے دوست واحباب کی عزت کرنی چاہئے۔

خلاصہ:

دنیا میں صرف والدین ایسی شخصیات ہیں جو صرف اور صرف ایک ہونے کے باوجود بھی بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں، ان کے حصول کے لئے کچھ مال ودولت خرچ کرنیکی ضرورت نہیں ہوتی؛ لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ہزاروں کوششوں کے باوجود بھی ان کا بدل نہیں ملتا، رہے دوسرے رشتے دار واقارب تو ان کی تعداد درجنوں میں ہوسکتی ہے اور اگر ایک نہ ہو تو دوسرا دستیاب ہو جاتا ہے، اس واضح حقیقت کے باوجود بھی انسان والدین کی خدمت کرنے میں ناکام رہتا ہے، کچھ لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ایک چیز آسانی سے میسر اور مہیا ہو جاتی ہے تو وہ اس کی قدر نہیں کرتے، ایسا ہی معاملہ کچھ لوگوں کا والدین کے ساتھ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی خدمت اور ان کی ضروریات کو سمجھنے اور پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تاریخ کے جھرونکھے

قیادت کا یہ منفی رویہ

مولانا فتح محمد ندوی، نئی دہلی

فاتح سندھ محمد بن قاسم کی شخصیت اور کارناموں سے برصغیر ہند کی سرزمین ہمیشہ سرسبز وشاداب رہے گی، آپ کے قدم رنجہ قیامت تک تیرگی میں اسلام کی آبرو بن کر یہاں کے ذروں کو روشنی عطا کرتے رہیں گے، غرض اس نوجوان کی بے مثال قربانیوں سے یہ سرزمین کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی؛ کیونکہ آج اس خطہ پر اسلام کی برکتوں کا جو ظہور باران رحمت کی شکل میں ہر وقت نازل ہوتا رہتا ہے، وہ سب اسی نوخیز حکمراں کی جہد مسلسل اور کوششوں کا نتیجہ ہے، بقول عظیم شاعر ماہر القادری: ؎

سندھ کے ظلمت کدے میں نور افشاں ہے کوئی
ابر کے دامن میں جیسے برق لہرائی ہوئی

''ایک مؤرخ کے الفاظ ہیں سندھ کی فتوحات میں ایک طرف محمد بن قاسم نے اپنے آپ کو رستم واسکندر سے زیادہ بڑا بہادر ثابت کیا تو دوسری طرف نوشیرواں سے بڑھ کر عادل اور رعایا پرور ظاہر ہوا، یہ نوجوان فتح مند سردار سندھ وپنجاب میں اتنی تیزی سے گھس رہا تھا اور بستیوں کی بستیاں اس کے اثر سے اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب سارا علاقہ ایک اسلامی علاقہ بن جائیگا؛ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی نے اس کمسن نوجوان کے ساتھ کیا برا سلوک کیا، کیسے اس جواں سال سپہ سالار کو موت کی نیند سلایا گیا، الامان والحفیظ! بنوامیہ کے فرماں روا عبدالملک بن مروان نے اپنے دو بیٹوں کو ولی عہد مقرر کیا، حسب دستور بڑا بیٹا ولید تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے بھائی سلیمان کو ولی عہدی سے دستبردار کرکے اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کردیا؛ لیکن اچانک ان امور کے تکمیل سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا اور بھائی سلیمان تخت پر براجمان ہوگیا، اب سلیمان نے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ان تمام لوگوں سے انتقام لینا شروع کیا جو ولید کی حمایت میں پیش پیش تھے، ان میں پہلا نام حجاج بن یوسف کا تھا؛ لیکن سلیمان کی تخت نشینی سے پہلے ہی حجاج کا انتقال ہوگیا تھا، اب سلیمان نے اپنی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حجاج کے داماد اور چچازاد بھائی محمد بن قاسم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، اور فرط غضب میں ان کو سندھ کی ولایت سے معزول کرکے دمشق کے جیل خانے میں ڈلوادیا، جہاں ان پر طرح طرح کے ظلم روا رکھے جاتے تھے، بالآخر یہ نوجوان جیل کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگیا''۔ (تاریخ کا سبق صفحہ ۲۸)

محمد بن قاسم نے اپنی اس شہادت سے پوری دنیائے اسلام کو یہ پیغام دیا کہ امیر کی اطاعت، اتحاد امت اور امن وشانتی میری جان اور اقتدار سے زیادہ عزیز تر ہے، ورنہ محمد بن قاسم کے پاس اتنی بڑی طاقت اور حوصلہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتے تھے سلیمان کی طاقت تو کجا، یہ محمد بن قاسم کی سعادت مندی اور وفاداری کی واضح دلیل تھی جو بیڑیوں اور آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے زنداں کی نذر ہوگئے۔

محمد بن قاسم کا یہ ذکر ضمناً نہیں بلکہ ان کے اس ذکر کے ساتھ بہت سے اہم تاریخی حقائق وابستہ ہیں، جو موجودہ عالم اسلام کے بحرانی حالات کو واکرسکتے ہیں، پہلی اور اہم حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے اپنی دور اندیشی اور فہم وفراست سے عالم اسلام کو ایک بڑی خانہ جنگی سے بچایا؛ کیونکہ محمد بن قاسم اگر دفاعی صورت اختیار کرتے تو لامحالہ اس کے منفی اثرات عالم اسلام کے اوپر پڑتے، دو بڑی طاقتیں آپس میں

ٹکراتی، جس کے سبب عالم اسلام کا اتحاد منتشر ہوتا، دشمن جو پہلے سے آستینوں میں چھپے بیٹھے تھے، وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عالم اسلام پر مسلط ہوجاتے یا اس کو تقسیم کرادیتے، واقعہ یہ ہے محمد بن قاسم نے تحمل سے کام لیتے ہوئے بے نفسی کی وہ مثال قائم کی جس نے ہابیل اور حضرت عثمان غنیؓ کی سنت کو زندہ کردیا۔

دراصل اسلام کی تاریخ میں ایسا کئی مرتبہ ہوا جب اسلامی غیرت و حمیت کے یہ گہر ہائے گرانمایہ ہم سے چھینے گئے اور ہمارے سینوں کو زخمی کیا گیا، ہمیں خون کے آنسو رلایا گیا، حدتو یہ ہے کہ ابھی بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے، کوئی ایسی آواز جو اسلامی غیرت سے بھری ہوئی ہو یا خلافت الٰہی کے حوالے سے کوئی کوشش کسی آواز میں شامل ہوگئی ہوتو یہ نشہ اقتدار کے متوالے اس کو چیل کوؤں کی طرح نوچ لیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں اسلام کو جتنا نقصان ہر دور میں ان میر صادق اور میر جعفروں سے پہنچا ہے اتنا شاید غیروں سے بھی نہ پہنچا ہو؛ کیونکہ دشمن جب آستینوں میں چھپ کر آتا ہے تو اس میں عقلوں کا بڑا امتحان ہوتا ہے، آج یہی میر صادق کا کردار عالم اسلام میں جو ممالک ادا کررہے ہیں، ان کا نام بھی لیا جاسکتا ہے؛ لیکن اختلاف کے خوف سے ہم مناسب نہیں سمجھتے، پھر بھی کچھ معروضات اور حالات کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے تو مطلع صاف ہوجائیگا کہ ان موجودہ بحرانوں کے پیچھے کون ہے، دراصل کچھ قومیں دنیا میں اپنے آپ کو مظلوم سمجھتی ہیں، اور اسی مظلومیت کے نام پر وہ انسانوں کا خون صبح و شام پی رہے ہیں؛ لیکن ان کی تشنگی ابھی نہیں بجھی، خدا خیر کرے!

ہم کسی ملک یا قوم کو اس کا نام لیکر مورد الزام نہیں ٹھہراتے اور ہمیں یہ حق بھی نہیں کہ الزام تراشی کریں لیکن جب حق بات کہنے کی نوبت آئے تو پھر کسی کی پروا نہیں کرنی چاہیے، لوگ لعن طعن کے ڈر سے آج حقائق چھپا رہے ہیں، یہ کون نہیں جانتا کہ عالم اسلام میں آج جو کچھ ہو رہا ہے پاکستان، افغانستان، شام، عراق اور سعودی عربیہ وغیرہ اس کے پیچھے کس کی سازش ہے، کس کے اوپر ملک گیری کا عفریت سوار ہے، کس کی وجہ سے ہر طرف ایک افراتفری کا ماحول ہے، اس کو سب جانتے ہیں سب کو معلوم ہے کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں، ویسے بھی مظلوموں کا لہو خود بولتا ہے، لاکھ کوئی چھپانے کی کوشش کرے اور جو چھپانے کی کوشش کر بھی رہے ہیں ان کو بھی کل معلوم ہوجائیگا کہ مظلومین کی فلک دوز آہیں دبے پاؤں ان کے چین وسکون کو ختم کردیگی، بس انتظار ہے اس لمحے کا کہ وہ کب آئے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ایران اپنے انتقامی جذبے سے باہر آئے اور مثبت سوچ کے ساتھ عالم اسلام کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہ ایران کی اور اس کے ساتھ دیگر اسلامی ممالک ذمہ داری ہے کہ وہ آپسی چشمک سے اوپر اٹھ کر سر سے سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ رنجشیں ختم کریں؛ کیونکہ منفی رویے سے کوئی بھی ملک ترقی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس منفی سوچ کے ساتھ قوموں کی قیادت کی جاسکتی ہے، قوموں کی قیادت کے لیے مثبت سوچ وفکر ناگزیر ہے، یہی مثبت اور پرامن پیغام محمد بن قاسم کی سیرت سے ملتا ہے اور اسی میں ملک اور قوموں کو استحکام اور بقا ملتی ہے، ورنہ جو قومیں منفی رجحان اور خود پسندی کی حامل ہوجاتی ہیں تو ان کو نہ بقا نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی استحکام؛ بلکہ ایسی قومیں تاریخ میں سرفرازی سے ہمیشہ کے لیے محروم و نامراد ہوجاتی ہیں اور وقت کی رفتار کے ساتھ ان کا وجود بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا ہے، ماضی میں جن ممالک نے منفی رویہ اختیار کیا ان کا انجام ہمارے سامنے ہے؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ ممالک تاریخ سے عبرت حاصل نہیں کررہے ہیں، جبکہ ماضی میں وہ کافی نقصان اٹھا چکے ہیں اور آئندہ بھی وہ کتنا بڑا نقصان اٹھائیں گے اس پر ویسے تو کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا لیکن ماضی اس پر گواہ ہے کہ ان کا انجام کیا ہوا، دلیل پیش کرنے کیلئے کسی کا نام لینا مناسب نہیں اور نہ ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ کسی ملک یا قوم کا انفرادی طور پر نام لیکر اس پر لب کشائی کریں، ہمارے نزدیک ایران کی بھی وہی اہمیت ہے جو دیگر ملکوں کی، ہمیں کسی سے ذاتی رنجش نہیں، خود گناہ گار اپنے گناہوں کی سزا پالے گا، حدیث میں

ہے کہ ظالم اس وقت تک نہیں مرتا جب تک وہ دنیا میں اپنے ظلم کی مکمل سزا پوری نہ کرلے۔

حلب جل رہا ہے، عراق جل رہا ہے، برما جل رہا ہے، غرضیکہ لوگوں کا آگ اور خون کے خوفناک منظر دیکھتے دیکھتے کلیجہ منہ کو آ گیا، ہر دن کی نئی صبح ہمارے لیے بدشگونی لیکر نمودار ہوتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں ترقی کر کے پہنچ گئی، ہم جہاں سے چلے تھے، آج بھی وہیں کھڑے ہیں، بس زبانی اعتبار سے ہم کچھ ہی کہہ لیں اور خود ہی خوش ہو جائیں؛ لیکن حقیقت وہی ہے جس کا ذکر ابھی ہوا، یہ ہمارے کھوکھلے دعوے ہیں، جو ہر پسماندہ قوموں کی علامت ہیں، خدارا ہم تمام اسلامی ملکوں کے سربراہوں سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ ملک گیری کی ہوس کو اپنے دل سے نکال دیں اور وہ راستہ اختیار کریں جس میں فلاح اور کامرانی ہو، یہ خونریزیاں اور ظلم وستم کا تسلسل ہرگز ثبات اور دوام عطا نہیں کرسکتا، ایک نہ ایک دن اس قیادت سے دستبردار ہونا ہے، یہ زمین اللہ کی ہے، اس کا مالک حقیقی وہی اور اسی کو یہاں دوام اور ثبات ہے، جب وہ چاہے گا تمہیں اپنی زمین سے نکال دیگا، دنیا کے دوسرے بڑے ظالم اور جابر حکمراں، فرعون، ہامان، نمرود شداد سب ملک گیری کا مزہ ذلت ورسوائی کے ساتھ چکھ چکے ہیں۔

❑❑❑❑❑❑

سماجی کارکن ماسٹر محمد شاہد کی حیات وخدمات

مولانا محمد سلیم مظاہری بانی ومہتمم جامعہ علوم القرآن، ست پورہ

ہر انسان کو دنیا چھوڑنی ہے اور موت کا مزہ چکھنا ہے، یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انسان منھ نہیں چرا سکتا، ہر انسان کو اس گھاٹی سے ہوکر گزرنا ہے، ابھی چند دنوں پہلے ۲۱رصفر ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۱رنومبر ۲۰۱۶ء بروز پیر ہم سبھوں کے ہردل عزیز جناب ماسٹر شاہد صاحب (بانی وسرپرست اعلی راؤ عبدالحمید پبلک اسکول کھجناور) اس دنیا سے داغ مفارقت دیکر چلے گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے کے بعد ان کو بھلا دینا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے، ایسے ہی نیک سیرت انسانوں میں سے ہمارے ماسٹر شاہد تھے، راقم الحروف ماسٹر مرحوم سے بہت دنوں سے واقف ہے، اللہ نے بیشمار خوبیوں سے مرصع کیا تھا، اہل علم اور اہل اللہ کے بڑے قدرداں تھے، اپنے اکابرین اور بزرگوں کی کچھ اس طرح قدر کرتے تھے کہ چھوٹوں کو سیکھنے کا سبق ملتا تھا، احقر پر بھی بہت عنایتیں آپ نے فرمائی ہمیشہ آپ نے پدری شفقتیں دیں، جب آپ پر کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو حیرت میں پڑ جاتا ہوں کہ کیا لکھوں۔

ماسٹر صاحب میں سماجی کام کرنے کا ایک حوصلہ تھا، اللہ تعالی نے خداداد صلاحیتوں سے بھی انہیں نوازا تھا، بہرحال آپ کی پیدائش ۱۹۶۷ء میں گاؤں کھجناور کے ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی، آپ کے والد کا اسم گرامی راؤ محمد انعام ہے جو ایک سنجیدہ انسان ہیں، آپ نے قرآن کریم کی تعلیم کیساتھ ساتھ پانچویں ہندی تک کی تعلیم اپنے ہی گاؤں میں پائی، اس کے بعد اعلی تعلیم کیلئے قصبہ مظفرآباد میں ویدک انٹر کالج میں انٹر تک کی تعلیم حاصل کی، اسکے بعد یہ سچا طالب اپنا علمی سفر آگے بڑھاتے ہوئے سہارنپور شہر میں آ گیا، J.V. Jain Digree College میں ایم اے، بی ایڈ کر کے اچھے نمبرات حاصل کئے، اس کے بعد آپ نے ادیب، ادیب کامل اور معلم کے امتحانات دئے، اس کے بعد آپ نے اپنے گاؤں کے اسکول میں کچھ دنوں تک تعلیمی خدمت انجام دی، اس کے بعد کھجناور کے قریب ہی جیوالہ ''بی، ایس، آر انٹر کالج'' میں تقریباً ۱۳ر سال علوم عصریہ کی تعلیم دی، پھر آپ نے ۲۰۰۸ء میں اپنے ہی گاؤں میں راؤ عبدالحمید پبلک اسکول کے نام سے قائم کیا اور آخری سانس تک اس کی خدمت میں مشغول رہے، ویسے تو آپ تقریباً ڈھائی سال سے بیمار تھے، سانس کا عارضہ تھا، لیکن اچانک Hart Attack ہونے کی وجہ سے آپ نے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

فکر وعمل

اسلام اور تحفظ عصمت

مولانا محمد سلمان کبیر نگری ایڈیٹر نئی روشنی، سنت کبیر نگر (یوپی)

اسلام اللہ کا نازل کردہ وہ مکمل دین ہے، جس میں انسانی فطرت اوراس کے تقاضوں کو ہر حال میں ملحوظ رکھا گیا ہے، چونکہ انسان اوراس کی فطرت کا خالق اللہ ہے، اور دین اسلام کا نازل کرنے والا بھی وہی ہے اس لئے فطرت کے تقاضوں سے جتنا آگاہ وہ ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، جنسی اور نفسانی خواہشات، مرد وعورت کا باہمی جذب وانجذ اب یہ ایک فطری جذبہ ہے، اللہ تعالی نے انسانی زندگی کو مرد عورت کے دوخانوں میں تقسیم کیا ہے اور فرمایا: "وَمِنْ اٰیٰتِہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا اِلَیْھَا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃً، ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون"۔ (سورۂ روم آیت ۲۱)

اللہ تعالی نے مرد سے عورت کی تخلیق فرما کر باہمی محبت ومودت اور سکون وطمانیت عطا کیا اور "خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء وتقوا اللّٰہ الذی تسائلون بہ والارحام" کے ذریعہ جہاں خلقت نسواں کے اصل کی رہنمائی کی ہے، وہیں اس کی عظمت وبرتری کو بھی اجاگر کیا ہے، جب مرد سے عورت کی تخلیق ہوئی تو خلقت کے اعتبار سے مرد کو عورت پر تفوق وبرتری حاصل نہ ہوگی کیوں کہ سماج کیلئے جس طرح مرد ضروری ہے اسی طرح عورت کا وجود بھی ناگزیر ہے اور اسی لئے مرد عورت میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے اور ادھورے ہوتے ہیں اور دونوں سے مل کر ہی سماج کی گاڑی آگے بڑھتی ہے گویا کہ مرد وعورت انسانی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جن میں سے اگر کوئی متاثر یا خراب ہوجائے تو زندگی کی گاڑی اپنے طبعی انداز میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اسلام آیا تو اس نے عورت کو مرد کے ہم پلہ قرار دیا اور دونوں کو حسن عمل سے آراستہ ہونے کی تاکید کی، اور دونوں کو حسن عمل پر جنت کی بشارت اور بدعملی جہنم کی وعید سنائی جب کہ اسلام سے قبل دنیا کے تمام مذاہب میں عورت ایک بے وزن اور بے وقعت شئے تھی، اور اسے سامان تجارت کی طرح خرید وفروخت اور ہبہ ووراثت میں استعمال کیا جاتا تھا، دنیا کے تمام تمدن ہائے حیات میں اسے ایک ناکارہ گناہ سے آلودہ اور شیطان کے کارندے کے طور پر دیکھا جاتا تھا، نتیجتاً عصمتوں کی پامالی، عفتوں کی بے حرمتی اور آبروؤں سے کھلواڑ چند باعث تشویش نہ تھی، مگر اسلام انسانی نسب اور انسانی آبرو کی حفاظت جس کا نصب العین ہے، اس نے ایک طرف تو بدکاری، فحاشی اور زنا جیسے جرائم کو حرام قرار دیا اور دوسری طرف اس کے جملہ اسباب پر پابندی لگا کر عورت کی نسوانیت اوراس کے مقام بلند کی حفاظت فرمائی، گھروں میں ٹھہرنے کا حکم دیا بے پردہ باہر گھومنے سے منع کیا، بلا محرم سفر کرنے پر پابندی لگائی، غیر مردوں کے ساتھ خلوت سے روکا، نامحرموں سے لچک دار آواز میں گفتگو ممنوع قرار دیا، خوشبو سے معطر ہو کر مردوں کے درمیان گذرنے کو جرم قرار دیا، شرمگاہوں کی حفاظت کی تاکید کی، نظروں کو نیچی رکھنے پر ابھارا، شوہر کی اطاعت کا حکم دیا اور اس کی نافرمانی سے روکا، بچوں کی تربیت اوران کی نگہداشت کی ترغیب فرمائی، حجاب اور پردہ کا تاکیدی حکم دے کر جمال وآرائش کی نمائش پر قدغن لگائی، نتیجہ یہ ہوا کہ عورت گھر کی چہار دیواری میں ایک فرمانبردار بیوی، ایک اطاعت شعار بیٹی اور لائق اطاعت ماں بن کر مسرت وسکون سے لبریز زندگی کی راہیں طے کرنے لگی اور اسلامی سماج کی ہر جگہ جنت نشاں بن گئی مگر اغیار کو اسلامی سماج کی یہ برتری اوراس کی مامونیت ذرا بھی پسند نہ آئی اور انہوں نے اس کے خلاف سازش رچنا شروع کیا اور مسلمان عورت کو گھر سے باہر نکالنے، پردہ سے آزاد کرنے، اور مرد سے

بغاوت پر آمادہ کرنے کیلئے ایک لمبے عرصہ تک سازشوں کے جال بنے گئے اور دام ہمرنگ زمیں میں عورت کو شکار کرلیا گیا، احمد امین، طہ حسین، محمود ابوریہ، سعد زغلول نجیب محفوظ، ہدی شعراوی، اور مصطفے کمال جیسے لوگ اسی سازشی ٹولہ کے چشم و چراغ تھے، عورتوں کے ان کے طبی میدان عمل گھر سے نکال کر دفتروں اور آفسوں میں اس لئے بٹھایا گیا تاکہ مردوں کی ہوس رانی کی تسکین کا سامان فراہم ہوسکے مگر اس کم فہم صنف کو سمجھایا گیا کہ اس طرح تم مرد کی گرفت اور اس کی حاکمیت سے چھٹکارا تو پاگئی مگر آفسوں میں اپنے باس اور دیگر ساتھیوں کی گرفت میں تڑپ کر رہ گئی، اور جنبش لب کی جرات نہ کرسکی، کیونکہ خود کر نیوالے کا کوئی علاج نہیں ہے، پہلے صرف شوہر کی تھی اب بہت سے لوگوں کی ہو گئی ہے، پہلے مامون ومحفوظ تھی، کوئی سر پھرا اس کی طرف للچائی نظر نہیں اٹھاسکتا تھا، مگر اب چوراہوں، نائٹ کلبوں، پارکوں، رقص گاہوں اور انجمنوں کی زینت بن چکی ہے، گزرگاہوں اور عوامی مجمعوں میں شیطانی نمائندوں کی نگاہیں اس کا پیچھا کرتی ہیں، نہ عورت محفوظ ہے، نہ اس کی آبرو، نہ اس کی عزت محفوظ ہے، اس لئے بڑے بڑے شہروں میں اغوا، زنا بالجبر اور اجتماعی عصمت دری جیسے واقعات مسلسل رونما ہوتے جارہے ہیں، جس کا آئے دن ہم اخبار کی سرخیوں پر مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، آج کل حال یہ ہے کہ ایک شخص خواہ وہ بازار کا تاجر ہو یا کارخانہ کا ملازم، کالج کا طالب علم ہو یا آفسوں کا افسر، وہ کسی ہوٹل میں بیٹھا ہو یا پارک میں سیر وتفریح کر رہا ہو، ہر جگہ صنف نازک معصیت کا پیغام لئے موجود ہوتی ہے، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں موجودہ تہذیب نے عورت کا مرد کے ساتھ کام کرنا لازم نہ کر دیا ہو، یہی نہیں بلکہ مرد وزن کی اس یکجائی کو اس قدر رنگین اور جاذب نظر بنا دیا کہ قدم قدم پر نگاہیں بھٹکنے لگتی ہیں اور بے راہ روی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے پر جنسی بھوک اور فاقہ کی کیفیت طاری ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ شہوانیت ہر طرف بھوک کا پیالہ لئے گھوم رہی ہے۔

اسی لئے اسلامی تعلیمات میں فطرت سے ہم آہنگی اور فطری تقاضوں کی موافقت پائی جاتی ہے اور دین میں صرف اسلام وہ مذہب ہے جو دعوی کرسکتا ہے، اس کا کوئی حکم اور کوئی قانون فطرت کا مخالف نہیں ہے، اس لئے عورت کی ناموس اور اس کی عصمت کا تحفظ صرف اسلامی سماج میں ہے، سماج کو بے حیائی، بدکرداری، فحاشی، جنس پرستی، اغوا، بدکاری، اور زنا بالجبر جیسے واقعات جرائم سے پاک کرنے کی ضمانت صرف اسلام میں ہے، دنیا کی تمام تحریکات اور تمام نظریات فطرت سے بغاوت کی وجہ دم توڑ چکی ہیں، اسی لئے دنیا کو ایک بار اسلام کا تجربہ بھی کرنا چاہئے: ؎

عافیت چاہو تو آؤ دامن اسلام میں
یہ وہ دریا ہے کہ جس میں ڈوبتا کوئی نہیں

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں مکمل طور سے اسلام کو سمجھنے اور اس کو سماج میں برتنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

وفیات

۳۰ر دسمبر ۲۰۱۶ء بروز جمعہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) کا انتقال ہوگیا ہے۔

ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کے چیف ایڈیٹر مولانا مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی پھوپھی عتیقہ خاتون کا انتقال ہوگیا ہے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب ''صدر وفاق المدارس پاکستان'' اور ''جامعہ فاروقیہ کراچی'' کے بانی وسرپرست کا انتقال ہوگیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی خلیفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کا انتقال ہوگیا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاوی جامعہ اسلامیہ ڈھابیل کا انتقال ہوگیا ہے۔

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب چشتی امیر مجلس تحفظ ختم نبوت کا انتقال ہوگیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نقوش اسلام کے تمام قارئین سے درخواست ہے کہ مرحومین کے لئے دعائے مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کریں۔

فضائل

تلاوت قرآن کی عظمت اوراس کا ادب واحترام

مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری

اللہ تعالی نے ارشادفرمایا:"فَاِذَا قَرَأتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" حدیث شریف میں ہے:"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" تم میں بہتر وہ ہے جوقرآن شریف سیکھے اورسکھلائے، معلوم ہوا کہ مومن کے لئے قرأت قرآن مجید بہترین کام ہے، اللہ تبارک وتعالی یہاں قرآن مجید کے بعض آداب کی تعلیم فرماتے ہیں، تاکہ آدمی بے احتیاطی سے اس بہتر کام کا اجر ضائع نہ کر بیٹھے، شیطان کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں سے روکے، خصوصاً قرآن شریف جیسے کام کو جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، کب ٹھنڈے دل سے گوارا کرسکتا ہے، ضرور اس کی کوشش ہوگی کہ مومن کو اس سے باز رکھے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو تو ایسی آفات میں مبتلا کردے جو قرأت قرآن شریف کا حقیقی فائدہ حاصل ہونے سے مانع ہو، شیطانی تدبیروں سے حفاظت کا یہی طریقہ ہوسکتا ہے کہ جب مومن قرأت قرآن مجید کا ارادہ کرے تو پہلے صدق دل سے حق تعالی پر بھروسہ کرے اور شیطان مردود کی ڈر سے بھاگ کر خداوند قدوس کی پناہ میں آجائے۔

قرآن مجید:

معبود کا کلام ہے، محبوب ومطلوب کے فرمودہ الفاظ ہیں، احکم الحاکمین کا کلام، سلطان السلاطین کا فرمان ہے، اس سطوت وجبروت والے بادشاہ کا قانون ہے جس کی ہمسری نہ کسی بڑے سے بڑے سے ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید کی تاثیر:

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ جب کلام پاک پڑھنے کیلئے کھولا کرتے تھے تو بیہوش ہوکر گرجاتے تھے اور زبان پر جاری ہوجاتا:"هذا كلام ربي، هذا كلام ربي" یہ میرے رب کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے۔

قرآن مجید کی صفت جلیلہ:

"لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ"۔ (سورۂ حشر آیت ۲۱)

اگر ہم اتارتے یہ قرآن شریف ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا، پھٹ جاتا، اللہ کے ڈر سے۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

یعنی قرآن مجید کی تاثیر اس قدر زبردست ہے، کہ اگر وہ پہاڑ جیسی سخت چیز پر اتارا جاتا اور اس میں سمجھ کا مادہ موجود ہوتا تو وہ بھی متکلم (خدا) کی عظمت کے سامنے دب جاتا اور مارے خوف کے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتا۔

قرآن مجید لفظاً اور معناً خدا کا کلام ہونے کی وجہ سے مقدس اور قابل تعظیم ہے جس کی تلاوت کیلئے چھونے اور ہاتھ لگانے کے لئے حتی کہ کتابت اور اشاعت کیلئے اس کے شایان شان آداب بھی ہیں، اور تکریم وآداب کے یہ تمام طریقے بھی انسان اپنی ناقص فکر سے تجویز نہیں کرسکتا تھا، اس لئے یہ بھی اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اللہ تعالی نے وحی کے ذریعہ یہ تمام آداب اور طریقے قرآن کریم میں بیان فرمادئے، مثال کے طور پر ہاتھ لگانے اور چھونے کے لئے خود قرآن کریم نے یہ آدب بتلایا:"لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" یعنی ہر قسم کی طہارت وپاکی کے بغیر قرآن کریم چھونا اور ہاتھ لگانا جائز اور روا نہیں۔

اسی طرح احکم الحاکمین کے شاہانہ کلام کے لئے احترام کا یہ طریقہ بتلایا کہ جب وہ پڑھا جائے تو سننے والوں پر نہ صرف یہ کہ ہیبت وعظمت کی خاموشی طاری ہوجائے بلکہ دل کے تمام گوشے اس کی طرف متوجہ ہوجائیں، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا:"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ"۔ (سورۂ اعراف آیت ۲۰۴)

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم ہو۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

یعنی قرآن مجید ایسی دولت بے بہا اور علم وہدایت کی کان ہے تو اس کی قرأت کا حق سامعین پر یہ ہے کہ پوری فکر وتوجہ سے ادھر کان لگائیں اس کی ہدایت کو سمع قبول سے سنیں اور ہر قسم کی بات چیت، شور وشغب اور ذکر وفکر چھوڑ کر ادب کے ساتھ خاموش رہیں تاکہ خدا کی رحمت اور مہربانی کے مستحق ہوں، اگر کافر اس طرح قرآن سنے تو کیا بعید ہے کہ خدا کی رحمت سے مشرف بایمان ہو جائے اور اگر پہلے سے مسلمان ہے تو ولی بن جائے یا کم از کم اس فعل کے اجر وثواب سے نوازا جائے۔

الاستعاذہ:

یعنی تلاوت سے پہلے "اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم" پڑھنا، اسی طرح تلاوت کے آداب میں سے ایک آدب قرآن کریم نے استعاذہ کا بھی بتلایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: "اِذَا قَرَاءَ تَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ"۔ (سورۂ نحل آیت ۹۸)

یعنی جب آپ قرآن کے پڑھنے کا ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ کے ذریعہ مردود شیطان سے پناہ مانگیں۔

تلاوت سے پہلے الفاظ استعاذہ کی تجویز میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں جن میں سے ایک واضح اور نمایاں مصلحت یہ ہے کہ جب کہیں کوئی شخص کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی تو شیطان اس نیکی سے باز رکھنے کیلئے طرح طرح کے وساوس اور برے خیالات انسان کے دل میں ڈالتا ہے، جس کی تصریح خود قرآن کریم نے اس طرح فرمائی: "اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ" یعنی شیطان وہ ہے جو انسانوں کے دلوں میں برے خیالات اور وسوسے ڈالتا ہے، پھر جو نیکی اپنی اہمیت وعظمت کے لحاظ سے جتنی زیادہ موجب قربت ہوتی ہے، اتنا ہی شیطان وسوسوں کے ذریعہ سد راہ بن جاتا ہے، اور شریعت اسلامیہ میں یہ امر مسلم ہے کہ تلاوت قرآن سے جتنا اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اتنا کسی عبادت سے نہیں ہوتا، جس پر علماء نے حضرت امام احمد بن حنبل کا ایک خواب بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا اور سوال کیا اے میرے پروردگار مجھے اپنے تک پہنچنے کا سب سے قریب ترین راستہ بتلا دیجئے، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''تلاوت قرآن''۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن مجید حق تعالیٰ کی ملاقات اور زیارت کا سامان ہے، لہٰذا تلاوت قرآن شریف سے پہلے شیطان وسوسوں سے بچنے کے لئے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھنا چاہئے، نیز تلاوت قرآن شریف کے علاوہ بھی اگر ہم کسی نیکی کا ارادہ کریں تو شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لئے بھی ہمیں استعاذہ کے یہی الفاظ پڑھنے چاہئیں، جیسا کہ قرآن کریم نے ہم کو اس کی ہدایت کی ہے: "وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ" یعنی جب شیطان تمہارے دل میں وسوسہ ڈالے تو فوراً استعاذہ کے الفاظ پڑھو، اسی لئے قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے ان الفاظ کا تجویز کرنا تلاوت کی عبادت اور اس کی اہمیت کے عین مطابق ہے۔

اور الفاظ استعاذہ کی تجویز میں ایک حکیمانہ پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اپنی عظمت اور برتری کے لحاظ سے ہمارے منہ اور زبان اس قابل نہیں ہیں کہ ہم اس کا تلفظ کرسکیں تاوقتیکہ اپنی زبان ودہن کو پورے طریقہ پر پاک نہ کرلیں، گویا کہ استعاذہ کے الفاظ ایک قسم کا روحانی آب زوال ہے جس سے ہم سب سے پہلے اپنی زبانوں اور اپنے منہ کو پاک کرلیتے ہیں، اور پھر خدا کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں، کسی عارف نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا: ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کریم کی آیتوں میں سے دو الگ الگ آیتیں ہیں، ایک سورۂ نمل میں جہاں حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کے اس خط کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ملکہ

سبا کولکھا گیا تھااور ملکہ سبانے غایت احترام کی وجہ سے اس کو کتاب کریم کا لقب دیا:"اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔

قرآن کریم کی دوسری آیت بسملہ وہ ہے جوتلاوت قرآن مجید کے لئے استعاذہ کے بعد پڑھی جاتی ہے،اور ہرسورت کے شروع میں لکھی ہوتی ہے،سورۂ نمل کی آیت بسم اللہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر اتری اورآغاز سورت والی بسم اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی،بسم اللہ سلیمانی سورۂ نمل کا جز واوراس کی مستقل آیت ہے،اور بسم اللہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کسی سورت کا جز واور کسی سورت کی مستقل آیت نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے، جو داخل قرآن ہے،مگر داخل سورت نہیں،بسم اللہ کا مقصد نزول قرآن کا ادب اورسورتوں کے مابین حدفاصل اورامتیاز قائم کرتا ہے۔

ہرکام کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کی حکمت:

تلاوت قرآن مجید سے پہلے اوراستعاذہ کے بعد بسم اللہ پڑھنے کی غرض وغایت اورمنشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ رخنے اور رکاوٹ یا شیطانی وساوس سے پناہ مانگنا کافی نہیں ہے جب تک اللہ تعالی کی رحمت وشفقت اوراس کی توفیق بھی شامل حال نہ ہو،اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسملہ کی اہمیت اوراس کی تاثیر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ہراہم کام جوخدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اورناتمام سارہتاہے،اس لئے ہرمسلمان مردوعورت بچے اور بوڑھے کا شیوہ اور شعار ہونا چاہئے کہ ہرکام کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرے تاکہ ہمارا کام خیروبرکت سے پورا اورمکمل ہوجائے،البتہ جوکام معصیت ونافرمانی سے متعلق ہواس کا ارتکاب بھی برا اوراس پرآیت رحمت کا تلاوت کرنااس سے بھی زیادہ برا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس آیت رحمت میں اللہ تعالی کے ناموں میں سے تین ناموں:"اللہ،رحمٰن،رحیم" کا ذکر کیا گیا ہے۔

لفظ"اللہ" خداوندقدوس کے ناموں میں سے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مشہوراور جامع نام ہے،اسی لئے عام طور پراللہ تعالی کی صفات کمالیہ کوظاہر کرنیوالے الفاظ،لفظ اللہ کے بعد ہی ذکر کئے جاتے ہیں،صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ نے لفظ"اللہ" کواسم ذات قرار دیا ہے،اسی کواسم اعظم بھی کہا ہے۔

اللہ رب العزت کی ذات کے سوااسی لفظ کوکسی دوسرے کے لئے نہ استعمال کیا جاسکتا ہےاورنہ ہی اس مفردلفظ کی جمع بنائی جاسکتی ہے۔

دوسرا لفظ"رحمٰن" اور تیسرا لفظ"رحیم" ہے، دونوں الفاظ کے معنی صاحب رحمت اورمہربان کے ہیں،عربی زبان کا ایک اصول ہے کہ الفاظ میں حروف کا جتنا جتنا اضافہ ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی معنی میں زیادتی اوراضافہ ضروری ہے، اس لئے بعض علماء نے صفت رحمان کا تعلق دنیااورآخرت کی نعمتوں نیزمومن وکافر کے ساتھ قرار دیا ہےاور صفت رحیم کاتعلق صرف آخرت کی نعمتوں اوراہل ایمان کے ساتھ بیان کیا ہے، پس ان تین الفاظ سے تلاوت کرنیوالا یا کاموں کی ابتدا کرنیوالا اس حقیقت کا اظہار کررہا ہے کہ اے خداوندقدوس جس کام کا میں آغاز کررہاہوں اس کے ابتدائی اسباب اورسامان کا خالق بھی تو ہی ہےاوراسباب وسامان کواستعمال کرنیکی توفیق دینے والا بھی تو ہی ہے اور میرے کاموں پر اجر وثواب اوراچھے نتائج پیدا کرنا بھی تیرے اختیار میں ہے، پس میرا یہ کام اللہ کی مدد رحمان کی توفیق اور رحیم کی مشفقانہ اعانت کے بغیرممکن نہیں:

جوکچھ ہوا ہے تیرے کرم سے ہوا
ہم کیا ہیں جوکوئی کام ہم سے ہوگا

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" باب رحمت ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بسم اللہ باب رحمت ہے، یہ داخلے کا دروازہ ہے، جب ایک مسلمان قرآن کریم کی تلاوت شروع کرنا چاہتا ہےتو وہ اس دروازے سے داخل ہوتا ہے۔

تلاوت کرنے والابندہ:

خدا کا بندہ نوکر بن کرنہیں، چاکر بن کرنہیں بلکہ بندہ بن کرآقا ومالک محسن ومنعم کا کلام پڑھے، کلام الٰہی کی عظمت شان کے پیش نظر

مشائخ نے چھ آداب ظاہری اور چھ آداب باطنی بیان فرمائے ہیں۔

ظاہری آداب:

۱-انتہائی احترام سے باوضورو بہ قبلہ بیٹھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ بہترین مجلس وہ ہے جس میں قبلہ کی طرف منہ کیا جائے۔ (طبرانی)

۲-پڑھنے میں جلدی نہ کرے، ترتیل وتجوید سے پڑھے۔

۳-رونے کی کوشش کرے چاہے بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو، یہ قرآن غمنا کی اور دلی خوف وتأثر کے ساتھ اترا ہے، لہٰذا جب اس کو پڑھا کرو تو رویا کرو، سو اگر تم رونہ سکو تو رونے کی شکل ہی بنا لیا کرو، اور اس کے ذریعہ بے نیازی حاصل کرو، نیز خوش آوازی سے پڑھو کیونکہ جس نے قرآن کے ذریعہ بے نیازی حاصل نہ کی نیز اس کو خوش آوازی سے نہ پڑھا وہ ہم سے نہیں۔ (ابن ماجہ)

۴-آیات رحمت وآیات عذاب کا حق ادا کرے یعنی آیات رحمت پر دعا مغفرت ورحمت مانگے اور آیات عذاب پر اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہے کہ اس کے سوا کوئی بھی چارہ ساز نہیں۔

۵-اگر ریا کا احتمال ہو یا کسی دوسرے مسلمان کی تکلیف وحرج کا اندیشہ ہو تو آہستہ پڑھے ورنہ آواز سے پڑھے۔

۶-خوش الحانی سے پڑھے۔

باطنی آداب:

۱-کلام پاک کی عظمت دل میں رکھے کہ کیا عالی مرتبہ کلام ہے۔

۲-اللہ رب العزت کی علوشان وکبریائی کو دل میں رکھے۔

۳-دل کو وساوس وخطرات سے پاک رکھے۔

۴-معانی کا تدبر کرے اور لذت کے ساتھ پڑھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شب تمام رات اس آیت کو پڑھ کر گزار دی: "اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادَكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡلَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُالۡحَكِيۡمِ"۔

اے اللہ! اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر مغفرت فرمادے تو تو عزت وحکمت والا ہے، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ایک رات اس آیت کو پڑھتے پڑھتے صبح کردی: "وَامۡتَازُوۡالۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ"

اے مجرمو! آج قیامت کے دن فرمانبرداروں سے الگ ہوجاؤ۔

۵-جن آیات کی تلاوت کر رہا ہے دل کو ان کے تابع بنادے مثلاً اگر آیت رحمت زبان پر ہے، دل سرور محض بن جائے اور آیت عذاب اگر آگئی ہے تو دل لرز جائے۔

۶-کانوں کو اس درجہ متوجہ بنادے کہ گویا خود خالق کائنات کلام فرمارہے ہیں اور یہ سن رہا ہے۔

قرآن کریم کا ادب اور اس کا صلہ:

حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتیؒ کی روایت ہے کہ ایک بزرگ نے سلطان محمود غزنویؒ کی وفات کے بعد انہیں خواب میں دیکھا پوچھا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا، جواب دیا کہ ایک رات میں کسی قصبہ میں مہمان تھا جس مکان میں ٹھہرا تھا وہاں طاق پر قرآن شریف کا ایک ورق رکھا تھا میں نے خیال کیا یہاں ورق مصحف رکھا ہوا ہے سونا نہ چاہئے، پھر دل میں خیال آیا کہ ورق مصحف کو کہیں اور رکھوا دوں اور خود یہاں آرام کرلوں، پھر سوچا کہ یہ بڑی بے ادبی ہے کہ اپنے آرام کی خاطر ورق مقدس کی جگہ تبدیل کردوں، اس ورق کو دوسری جگہ منتقل نہیں کیا اور تمام رات جاگتا رہا، میں نے کلام پاک کے ساتھ جو ادب کیا اس کے بدلے حق تعالیٰ نے مجھ کو بخش دیا۔ (دلیل العارفین مجلس پنجم صفحہ ۲۲)

کلام الٰهی کے ادب کے سبب توفیق توبه:

حضرت منصور بن عمار کو راستہ میں کاغذ کا ایک پرزہ (جس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر تھا) پڑا ہوا ملا، اس کو رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہ ملی، آپ نے عظمت کے تصور سے اس کو گولی بنا کر نگل لیا، آپ نے رات کو خواب دیکھا کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تیرے لئے حکمت ودانائی کی راہیں آج سے اس لئے کشادہ کردیں کہ تو نے ہمارے کلام کی تعظیم کی۔

قرآن مجید کا نام بھی ادب سے لینا چاهئیے:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن اٹھالانا، یہ مناسب نہیں ہے، قرآن پاک، قرآن شریف یا قرآن مجید کہنا چاہئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے: ق والقرآن المجید" نازل فرمایا ہے، اسی طرح خالی یوں کہنا کہ میں مدینہ گیا یا مکہ گیا تھا مناسب نہیں، مدینہ طیبہ، مدینہ منورہ یا مدینہ پاک یا مدینہ شریف، مکہ مکرمہ، مکہ شریف کہنا چاہئے، تلاوت کے آداب آپ نے پڑھ لیئے! سن لیئے! اب تلاوت فرمائیے: "اَللّٰهُمَّ نَوِّرۡ بِكِتَابِكَ اَبۡصَارَنَا وَاَطۡلِقۡ بِهٖ اَلۡسِنَتَنَا وَاشۡرَحۡ بِهٖ صُدُوۡرَنَا وَاسۡتَعۡمَلۡ بِهٖ اَجۡسَادَنَا بِحَوۡلِكَ وَقُوَّتِكَ فَاِنَّهٗ لَاحَوۡلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِرَحۡمَتِكَ يٰااَرۡحَمَ الرَّاحِمِيۡنَ"۔

❑❑❑❑❑❑

تبصرے

نئی کتابوں پر تبصرہ

محمد مسعود عزیزی ندوی

نام کتاب: مجالس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

نام مصنف: مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

صفحات: ۲۷۲ر

ناشر: مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی، بھٹکل (کرناٹک)

پیش نظر کتاب مولانا محمد الیاس صاحب ندوی بھٹکلی کی بیش بہا اور قیمتی شاہکار ہے، جو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی مجالس اور عطر بیز ملفوظات کا دلکش مجموعہ ہے، جس میں تمام ملفوظات کو واقعات کی روشنی میں ایک نئے ادبی اسلوب میں ترتیب دیا گیا ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب ندوی ایک بلند پایہ عالم دین، بہترین قلم کار، مؤرخ، مصنف اور تجزیہ نگار ہیں، اللہ تعالی نے ان کے ذہن وفکر میں بالیدگی اور سنجیدگی رکھی ہے، جو اپنی خداداد صلاحیت اور علمی قابلیت سے زندگی کے ایسے واقعات سے بھی نکتہ اور کوئی نہ کوئی نتیجہ اور دعوتی پہلو نکال لیتے ہیں، جن کی طرف عام طور سے لوگوں کا ذہن نہیں جاتا، پھر اپنے نکات اور نتائج کو اپنے البیلے اور نرالے پرکشش اسلوب میں بڑی سادگی سے قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، جن سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے اور عش عش کرتا رہ جاتا ہے، یہ خداداد ملکہ اور صلاحیت ہے جو مولانا کے حصہ میں آئی ہے، مولانا موصوف کی مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، جو اہل علم اور عوام میں مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اس انداز پر مرتب کر کے عصر حاضر کے ذوق کے مطابق پیش کیا ہے، انہوں نے مجالس کا جو طرز اختیار کیا ہے، اس سے قارئین کو پڑھنے کی رغبت اور دلچسپی بھی ہوتی ہے، اور ان کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے، کتاب کا عنوان اور اس میں پیش کردہ مواد کائنات کی عظیم ہستی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے، جس میں اس طرح عہد نبوی کی پراثر مجالس کی خوبصورت عکاسی اور منظر کشی کی گئی ہے کہ قاری ایک مرتبہ کتاب کو شروع کرنے کے بعد اس کو مکمل کئے بغیر نہیں رہ پاتا، اور اس کا جذبہ دروں مہمیز لگاتا ہے اور کتاب کے مطالعہ کی تکمیل کی طرف لے جاتا ہے، اس عظیم کتاب پر مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا مقدمہ اور خطیب عصر حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی تقریظ ہے، جنہوں نے مصنف کے اس عمل کی تحسین وداد دی ہے، اللہ تعالی قبول فرمائے، اور زیادہ سے زیادہ قارئین کو فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

نام کتاب: نائجیریا کے بہادر

نام مصنف: نجیب گیلانی

ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی بھٹکلی

صفحات: ۱۷۶ر

ناشر: معہد امام حسن البناء شہید، بھٹکل (کرناٹک)

پیش نظر کتاب ایک اسلامی تاریخی ناول ہے، یہ ناول دراصل عربی زبان میں تھا، اسکے لکھنے والے خود بڑے ادیب ہیں، جن کو عربی زبان میں بڑی قدرت ہے، پھر ترجمہ نگار ہمارے دوست رفیق درس مولانا ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی نے جس انداز میں ترجمہ کیا، وہ ترجمہ ہی نہیں بلکہ ترجمانی ہے کیونکہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہی نہیں کہ یہ ترجمہ ہے، بلکہ اصل کتاب محسوس ہوتی ہے، اس میں دراصل ترجمہ نگار کے قلم کی کلاکاری ہے کہ انہوں نے جو اسلوب وانداز اختیار کیا اس نے مستقل کتاب کا روپ دھار لیا، ڈاکٹر اطہر صاحب ایک کہنہ مشق قلم کار ہیں، جن کے قلم سے کئی درجن کتابیں نکل کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں، ناول پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، جس میں اخلاقیات کی تعلیم ہے، اس میں ناول کے کردار کچھ اس طرح ہیں، عثمان اُمینو، ذور، جامیکا (نرس) شیخ عبداللہ (قادریہ کے ایک شیخ) عبدالرحیم (لاجوس اور ایبو کے اسفار میں اور جنگوں میں عثمان کے ساتھی) فادر ٹوم (انگریز مبلغ جو ایبو کے ایک گاؤں میں رہتا ہے) میڈیم علیہ (لاجوس کے عرب محلّہ میں ہوٹل کی مالکہ) ثانوی کردار (جیلر، گاؤں کے پردھان، انسپکٹرس، فوج، شہری، تاجر، خدام وغیرہ ہنی مین (مشنری ہسپتال کا ڈاکٹر) قائدین (احمد بیللو، اوجر کو چوکوما) ناول کی جگہ: متحدہ نائجیریا، ناول کا زمانہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک، کتابت وطباعت عمدہ اور معیاری ہے، اللہ تعالی مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مترجم وناشر کو بھی اجر عظیم عطا فرمائے، مولانا ناصر اکرمی نے یہ کتاب اپنے معہد امام حسن البناء شہید سے ممتاز انداز میں شائع کی ہے، امید ہے کہ قارئین حاصل کر کے فائدہ اٹھائیں گے۔ ❑❑